



مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

سیرتِ طیبہ میں  
صبر و مصابرت کے مختلف ادوار  
سورۃ الکہف کی آیات ۲۷ تا ۲۹ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

نام کتاب \_\_\_\_\_ سیرتِ طیبہ میں صبر و مصابرت کے مختلف ادوار (درس ۲۱)  
 طبع اول (اگست ۲۰۰۳ء) \_\_\_\_\_ ۲۲۰۰  
 ناشر \_\_\_\_\_ ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور  
 مقام اشاعت \_\_\_\_\_ ۳۶۔ کئے، ماڈل ٹاؤن، لاہور  
 فون: ۳-۵۸۶۹۵۰۱  
 مطبع \_\_\_\_\_ شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور  
 قیمت \_\_\_\_\_ ۱۵ روپے

## سیرت طیبہ میں صبر و مصابرت کے مختلف ادوار

سورۃ الکہف کی آیات ۲۷ تا ۲۹ کی روشنی میں

لحمده ووصلی علی رسولہ الکریم ..... اما بعد:

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم - بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
﴿وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ط لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ؕ وَلَنْ  
تَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحِدًا ؕ﴾ وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُونَ رَبَّهُمْ  
بِالْغَدَوَةِ وَالْعَیْشِ یُرِیدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَیْنُکَ عَنْهُمْ ؕ تُرِیدُ زِینَةَ  
الْحَیْوةِ الدُّنْیَا ؕ وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ  
أَمْرُهُ فُرُطًا ؕ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّکُمْ ؕ فَمَنْ شَاءَ فَلْیُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ  
فَلْیُکْفُرْ ؕ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِیْنَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ط وَإِنْ یُسْتَغِیْثُوا  
یُغَاثُوا بِمَاءٍ کَا الْمُهْلِ یَشْوِی الْوُجُوهَ ط بِئْسَ الشَّرَابُ ط وَبَآءُ  
مُرْتَفَقًا ﴿﴾ ..... صدق اللہ العظیم

ہمارا آج کا درس اگرچہ صبر اور مصابرت فی سبیل اللہ کے نقطہ نگاہ سے نبی  
اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے ایک خاص دور اور آپ کی سیرت مطہرہ کے ایک اہم  
باب کے مطالعے سے متعلق ہے تاہم اس کے لئے سورۃ الکہف کی یہ تین آیات (۲۷ تا  
۲۹) عنوان کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان آیات مبارکہ کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

”اور تلاوت کرتے رہو (اس کلام کی) جو کہ وحی کیا گیا ہے تمہاری جانب  
تمہارے پروردگار کی کتاب میں سے۔ اُس کی باتوں کا بدلنے والا کوئی نہیں۔  
اور تم اس کے سوا اپنے لئے کوئی اور پناہ گاہ نہ پاسکو گے۔ اور رو کے رکھو اپنے

آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام جو اس کی رضا جوئی ہی کے خواہاں ہیں اور تمہاری آنکھیں ان سے متجاوز نہ ہوں، دُنیوی زندگی کی زینت کی طلب میں۔ اور مت کہنا مانو اس کا جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو پیروی کر رہا ہے اپنی خواہش نفس کی اور اس کا معاملہ حدود سے تجاوز پر مبنی ہے۔ اور کہہ دو کہ یہ سراسر حق ہے تمہارے رب کی جانب سے، تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ ہم نے تیار کی ہے ان ظالموں کے لئے ایک بڑی آگ، اس کی قاتیں انہیں اپنے گھیرے میں لیں گی۔ اور اگر یہ فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی ایسے پانی سے کی جائے گی جو کھولتے ہوئے تانبے کی مانند ہوگا، جو جھلس کر رکھ دے گا ان کے چہروں کو۔ بہت ہی بری ہوگی وہ پینے کی چیز اور بہت ہی برا ہوگا وہ انجام جس سے وہ دوچار ہوں گے۔“

یہ بات سابقہ درس میں واضح کی جا چکی ہے، اور ویسے بھی اس منتخب نصاب کے بحیثیت مجموعی مطالعے سے یہ بات بالکل مبرہن ہو چکی ہے کہ قرآن مجید کی دعوت ایک انقلابی دعوت ہے۔۔۔ دعوتِ ایمان یعنی اللہ آخرت اور رسالت پر ایمان کی بنیاد پر ایک بھرپور انقلابی دعوت۔ بقول حالی ۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی  
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

پھر اس دعوت کی بنیاد پر ایک مضبوط جماعت کی تشکیل اور اس کی تربیت، پھر ماحول سے تصادم کا معاملہ، پھر اس تصادم کا مختلف ادوار سے گزر کر اللہ کے دین کے غلبے اور اس کے بالفعل نفاذ و قیام پر منتج ہونا، یہ ہے خلاصہ اور لب لباب اس عملی جدوجہد کا جس کا نقشہ ہمیں سیرتِ طیبہ میں نظر آتا ہے اور جس کے خطوط ہمیں آیاتِ قرآنی میں ملتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محض دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت سے یہ معاملہ نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہے۔ مجرد دعوت و تبلیغ کے کام میں یا بدھ مت کے بھکشوؤں کے مانند صرف اخلاقی تعلیمات کی نشر و اشاعت میں وہ مراحل نہیں آیا کرتے جو کسی انقلابی دعوت میں آتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی دعوت کا اٹھان آغاز ہی سے ایک انقلابی

دعوت کا تھا۔ یہ بات اس سے قبل عرض کی جا چکی ہے کہ اس کے خلاف پہلا رد عمل اس وقت کے ماحول کی جانب سے استہزا اور تمسخر کی شکل میں ہوا، چٹکیوں میں بات کو اڑانے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے پہلی تلقین جو آنحضور ﷺ کو کی گئی وہ یہی تھی کہ اے نبی! جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس پر آپ صبر کیجئے، اسے جھیلئے اور ثابت قدم رہئے:

﴿وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا﴾ (المزمل: ۱۰)

سابقہ درس میں یہ بات بھی بیان ہوئی تھی کہ اگرچہ حضور ﷺ کی دعوت کا رخ اس وقت کی سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات کی طرف تھا لیکن ابتداءً جن لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا ان میں ایک بڑی تعداد غلاموں اور نو جوانوں کے طبقے سے تھی۔ چنانچہ اس معاشرے میں تشدد اور ایذا (Persecution) کا اولین ہدف یہی دو طبقات بنے۔ تشدد اور ایذا رسانی کا یہ معاملہ سن چار تا چھ نبوی کے دوران اپنی پوری انتہا کو پہنچا اور اسی کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت ملی۔ ہجرت حبشہ سے وقتی طور پر حالات میں بہتری پیدا ہوئی جیسے کہ کسی بوائے کے سے اگر بھاپ خارج ہو جائے تو اس کی اندر کی ہلچل میں سکون کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ بہت سے مسلمان ہجرت کر گئے لہذا کشمکش اور تصادم کی وہ فضا وقتی طور پر کچھ ٹھنڈی پڑی اور مختلف گھرانوں میں اہل ایمان پر تشدد کا جو معاملہ جاری تھا اس کی شدت میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اب ساری مخالفت مرتکز ہو گئی خود محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر!

### آنحضور ﷺ کی شخصی مخالفت

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ وہ معاملہ بہر حال نہ ہو سکتا تھا جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا یا جو حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ اور آلِ یاسر رضی اللہ عنہم کے ساتھ پیش آیا۔ یہ بات روایات سے ثابت ہے کہ جس وقت آلِ یاسر (رضی اللہ عنہم) پر ابو جہل دست درازیاں کرتا اور انہیں تشدد کا نشانہ بناتا

تھا، حضور ﷺ کا اگر ان کے سامنے سے گزر رہوتا تو آپ انہیں صبر اور استقامت کی تلقین فرماتے۔ گویا صبر کا وہ حکم جو آنحضور ﷺ کو اللہ کی جانب سے پیہم مل رہا تھا آپ اسی کو ان الفاظ میں آل یاسر (رضی اللہ عنہم) کی جانب منتقل فرما دیتے تھے کہ: **إِصْبِرُوا يَا آلِ يَاسِرٍ فَإِنَّ مَوْعِدَكُمْ الْجَنَّةُ** ”کہ اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو اور اطمینان رکھو کہ تمہارے وعدے کی جگہ جنت ہے۔“ لیکن ظاہر بات ہے کہ اس طرح کے جسمانی تشدد کا کوئی معاملہ شخصاً محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کی وجہ بھی سمجھ لیجئے ادیکھئے اللہ تعالیٰ کی حکمت بھی کامل ہے اور قدرت بھی۔ وہ ﴿فَعَالَ لِمَا يُرِيدُ﴾ ہے۔ وہ جو کرنا چاہتا ہے اس کے لئے مناسب حالات پیدا فرماتا ہے۔ جس طرح حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دولت حضور ﷺ کے ظاہری غنا اور خوشحالی کا سبب بن گئی ﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَى﴾ کہ مکے کی متمول ترین خاتون آپ کے حوالہ عقد میں آئیں اور انہوں نے اپنا سب کچھ آپ کے قدموں میں ڈال دیا اسی طرح حکمت خداوندی نے مکے کی اس قبائلی زندگی میں نبی اکرم ﷺ کو ایک اور اعتبار سے بھی تحفظ عطا فرمایا تھا۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ سیرت مطہرہ کا یہ ایک اہم پہلو ہے کہ حضور ﷺ کے دادا عبدالمطلب کی زندگی میں پورے قبیلہ قریش میں بنو ہاشم کو ایک فیصلہ کن اہمیت اور حیثیت حاصل تھی۔ بنو ہاشم کی سرداری کا منصب عبدالمطلب کو حاصل تھا جو بے پناہ شخصی وجاہت کے حامل تھے۔ ان کے انتقال کے بعد حضور ﷺ کے تایا زبیر جانشین بنے اور بنی ہاشم کے سردار قرار پائے۔ اکثر لوگ اس بات سے لاعلم ہیں کہ دادا کے انتقال کے بعد حضور ﷺ کی کفالت اصلاً آپ کے تایا زبیر نے کی۔ وہ بھی اپنی ذاتی شخصیت کے اعتبار سے اس حیثیت کے مالک تھے کہ انہوں نے بنو ہاشم کی سیادت کو برقرار رکھا۔ ان کے انتقال کے بعد بنو ہاشم میں شخصی وجاہت اور ذاتی حیثیت کے اعتبار سے کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا کہ جو قریش میں بنو ہاشم کی سیادت کا سکہ منوالیتا۔ بہر حال وہ سیادت جیسی کچھ بھی تھی ابو طالب کے ہاتھ آئی۔ ابو طالب اگرچہ نبی اکرم ﷺ پر مرتے دم

تک ایمان نہیں لائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حضور ﷺ کی محبت انتہائی درجے میں جاگزیں کر دی تھی جس کی وجہ سے خاندان بنی ہاشم کا تعاون یا یوں کہہ لیجئے کہ ان کی جانب سے ایک حمایت جو اس قبائلی معاشرے میں بڑی اہمیت کی حامل تھی نبی اکرم ﷺ کو حاصل رہی۔ چنانچہ مشرکین مکہ کے لئے نبی اکرم ﷺ کے خلاف اس طرح کا معاملہ کرنا ممکن نہ تھا جس طرح کہ حضرت بلالؓ یا حضرت خبابؓ یا آل یاسرؓ کے ساتھ ہوا۔ اکادکا واقعات ضرور ملتے ہیں مثلاً ایک مرتبہ آپؐ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے ابو جہل کچھ فاصلے پر موجود تھا اس نے اپنے ہم نشینوں سے یہ بات کہی کہ ہے کوئی شخص جو ان کی خبر لے! عقبہ بن ابی معیط اٹھا اور اس نے ایک چادر کو بل دے کر اسے ایک پھندے کی شکل میں حضور ﷺ کے گلے میں ڈالا اور اس کے دونوں سروں کو اس طرح کھینچا کہ حضور ﷺ کی آنکھیں ابل آئیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اطلاع ہوئی تو وہ دوڑے ہوئے آئے۔ انہوں نے فرمایا: اتَّقِثْلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ ”بدبختو! کیا تم ایک شخص کو صرف اس جرم کی پاداش میں قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے!“ لوگوں نے حضور ﷺ کو تو چھوڑ دیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پینٹا شروع کیا۔ اتنا مارا کہ یہ سمجھ کر چھوڑا کہ اب یہ ہلاک ہو چکے ہیں۔ اسی طرح کا ایک اور معاملہ بھی پیش آیا۔ حضور ﷺ نماز پڑھ رہے تھے ابو جہل نے اسی عقبہ بن ابی معیط کو اشارہ کیا اور وہ ایک اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی اٹھا کر لایا اور جب حضور ﷺ سجدے میں گئے تو اس نے وہ اوجھڑی آپؐ کی گردن پر رکھ دی۔ اس طرح کی ایذا رسانی اور اس نوع کے معاملات اکادکا نبی اکرم ﷺ کے ساتھ پیش آتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ صبح آپ ﷺ گھر سے نکلتے تو ابو لہب اور اس کی بیوی آپؐ کے دروازے کے سامنے کانٹے بچھا دیتے تھے یا یہ کہ آپؐ کسی گلی سے گزر رہے ہیں اور کسی نے اوپر سے راکھ یا خاک آپؐ کے سر پر ڈال دی۔

### ایک نیا جال

اس قسم کے بعض واقعات تو یقیناً ہوئے لیکن ہجرت حبشہ کے بعد ان میں ایک نئی

کیفیت کا اضافہ ہوا۔ اور وہ یہ کہ جب لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ بات کسی طریقے سے بھی رک نہیں رہی، ہمارے تشدد کے نتیجے میں کوئی ایک شخص بھی اس نئے دین سے واپس نہیں لوٹا، تو انہوں نے ایک کام تو یہ کیا کہ لالچ کا پھندا پھینکا۔ ابوطالب کے پاس آئے کہ اگر تمہارا بھتیجا بادشاہی چاہتا ہے تو ہم اسے اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں، اگر اسے کچھ دولت کی خواہش ہے تو ہم اس کے قدموں میں دولت کا انبار لگا دیں گے، اگر اسے کسی جگہ نکاح کرنا ہو تو اشارہ کرے، عرب کے جس گھرانے میں وہ چاہے ہم شادی کرادیں گے۔ ہم اس کا ہر مطالبہ ماننے کے لئے تیار ہیں لیکن کسی طریقے سے تم اس دعوت سے اسے روکو۔ ابوطالب نے حضور ﷺ کو بلایا، ساری بات سامنے رکھی۔ حضور ﷺ کی عزیمت دیکھئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ دیں تب بھی میں اس دعوت سے باز نہیں آ سکتا۔

### ابوطالب پر قریش کا دباؤ

لالچ (temptation) کے پھندے سے بھی جب آپ ﷺ صاف بچ نکلے تو پھر ابوطالب کو دھمکی دی گئی کہ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے اب یا تو تم اپنے بھتیجے کی حمایت سے دستکش ہو جاؤ یا اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، ہم نپٹ لیں گے، لیکن اگر تمہارا فیصلہ یہ ہے کہ تم حسب سابق خاندانی سطح پر محمد (ﷺ) کی پشت پناہی اور حمایت برقرار رکھو گے تو پھر ٹھیک ہے، کھلے میدان میں آؤ، اب بنی ہاشم کا اور قریش کے بقیہ گھرانوں کا کھلا تصادم ہو گا۔ ابوطالب نے گھبرا کر نبی اکرم ﷺ کے سامنے یہ بات بھی رکھی اور ساتھ ہی یہ کہا کہ بھتیجے! مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔ گویا ابوطالب کی ہمت بھی جواب دہتی نظر آئی، محسوس ہو رہا تھا کہ قریش کی طرف سے اس متحدہ چیلنج کو قبول کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ روایات میں آتا ہے کہ شدتِ تاثر سے حضور ﷺ کی آنکھیں نم ہو گئیں کہ یہ ایک دنیوی سہارا جواب تک حاصل تھا، شاید یہ بھی اب ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ لیکن نہایت پر عزم لہجے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ چچا جان! خدا کی قسم یا تو میں اس کام میں اب



ہلاک ہو جاؤں گا اور یا اللہ اس کام کو پورا کرے گا اس سے قدم پیچھے ہٹانے کا کوئی سوال نہیں! اللہ نے اس موقع پر ابوطالب کو بھی ہمت عطا فرمائی انہوں نے کہا کہ پھر ٹھیک ہے، جیتے میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔

### شعب بنی ہاشم

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قریش کی جانب سے اب نبی اکرم ﷺ اور بنی ہاشم کے خلاف ایک متفقہ اقدام ہوا جس کے نتیجے میں یہ طے کیا گیا کہ بنی ہاشم سے کامل مقاطعہ کیا جائے۔ کوئی خرید و فروخت، کوئی لین دین اب ان کے ساتھ نہ کیا جائے اور ہر نوع کا تعلق منقطع کر لیا جائے۔ یہ ایک نوع کا Socio-economic بائیکاٹ تھا جس نے تین سال کی ایک قید کی شکل اختیار کی۔ سن سات نبوی سے شروع ہو کر سن دس نبوی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک گھائی میں جسے شعب بنی ہاشم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ خاندان بنو ہاشم محصور و مقید تھا۔ مکمل ناکہ بندی تھی، کوئی چیز اندر داخل نہیں ہو سکتی تھی، کوئی لین دین ممکن نہیں تھا۔ کچھ نیک دل لوگ کہیں رات کی تاریکیوں میں چھپ چھپا کر کبھی کبھار کھانے پینے کی کوئی چیز پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے تھے ورنہ یہ کہ پورا پہرا موجود تھا۔ یہ ہے سخت ترین قید کی وہ کیفیت کہ جس کے دوران ایسا وقت بھی آیا کہ اس ”وادی غیر ذی زرع“ میں جو جھاڑیاں وغیرہ تھیں ان کے پتے چٹ کر لئے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بنی ہاشم کے بلبلا تے بچوں کو اس کے سوا اور کچھ میسر نہیں تھا کہ سوکھے چمڑے ابال کر ان کا پانی ان کے حلق میں ٹپکا دیا جائے۔ بہر حال نبی اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھ خاندان بنی ہاشم نے اس سختی کو جھیلا اور برداشت کیا۔ یہ اسی صبر و مصابرت کا معاملہ تھا کہ مقابلے میں ہاتھ نہیں اٹھائے جا رہے لیکن اپنے موقف پر اسی طرح ڈٹے ہوئے ہیں کہ ایک انچ پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال نہیں۔

کچھ صلح پسند اور نیک دل لوگوں کی مداخلت سے سن دس (نبوی) میں یہ مقاطعہ ختم ہو جاتا ہے۔ اخلاقی طور پر کفار کو اس معاملے میں شکست ہوئی، اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے موقف میں کوئی نرمی اور کوئی لچک پیدا نہیں کی، آپ ﷺ

نے اور آپ کے خاندان نے ہر سختی کو جھیلا اور تکلیف کو برداشت کیا۔ بالآخر یہ مقاطعہ ختم ہوا۔

### شخصی ابتلاء کا نقطہ عروج: یوم طائف

لوگوں کی طرف سے ڈالی ہوئی آزمائش کا سلسلہ کچھ کم ہوا تو اللہ کی طرف سے ایک براہ راست آزمائش بھی آپ کی منتظر تھی۔ اس پہلو سے گویا شخصہ نبی اکرم ﷺ کے لئے آزمائش کا معاملہ نقطہ عروج کو پہنچ گیا۔ سن دس نبوی میں حضرت خدیجہ الکبریٰ کا بھی انتقال ہو جاتا ہے اور ابوطالب کا بھی۔ گھر میں دلجوئی کرنے والی رفیقہ حیات تھی وہ بھی نہ رہی اور خاندانی اعتبار سے سہارا دینے والا ایک پشت پناہ تھا ابوطالب وہ بھی رخصت ہوا۔ سرداران قریش کے حوصلے یکدم بلند ہو گئے۔ مشورے ہونے لگے کہ اب وقت ہے کہ آخری فیصلہ کر ڈالا جائے آخری اقدام اب کر دیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ اس صورت حال کو دیکھ کر منگے سے مایوس ہو کر طائف کا سفر کرتے ہیں۔ عام راستہ آپ نے اختیار نہیں کیا اندیشہ تھا کہ آپ کی جان لینے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ ایک نہایت دشوار گزار راستہ اختیار کیا۔ صرف ایک غلام حضرت زید رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ طائف پہنچ کر آپ نے وہاں کے جو تین بڑے سردار تھے ان تینوں سے ملاقات کی لیکن ہر طرف سے انتہائی دل کو توڑ دینے والا جواب سننے کو ملا۔ سب نے استہزا، تمسخر اور مذاق کا نشانہ بنایا۔ ایک نے نہایت تمسخر آمیز لہجے میں کہا (معاذ اللہ نقل کفر کفر نباشد) کہ میں تم سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا اگر تم جھوٹے ہو تو منہ لگانے کے قابل نہیں اور اگر سچے ہو تو ہو سکتا ہے میں کہیں توہین کر بیٹھوں اور اللہ کے نبی کی توہین میرے لئے وبال جان بن جائے لہذا آپ تشریف لے جائیے! کسی نے کہا کہ کیا اللہ کو آپ کے ہوا کوئی نہیں ملا تھا نبوت اور رسالت کے لئے؟ اسی طرح کے دل توڑ دینے والے اور جگر چھلنی کر دینے والے جواب سن کر نبی اکرم ﷺ لوٹنے کا ارادہ فرما رہے تھے کہ وہ لوگ کچھ اوباش لوگوں کو اشارہ کرتے ہیں کہ ذرا ان کی خبر لو۔ پھر وہ نقشہ جمتا ہے جس کو بیان کرتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی

ہے۔ طائف کی گلیاں ہیں اللہ کا رسول ہے اور بعینہ وہی نقشہ ہے جو ہماری آبادیوں میں کبھی بکھار دیکھنے میں آتا ہے کہ جیسے کوئی دیوانہ شخص ہو اور ادب باش چھو کرے چاروں طرف سے اسے کنکریاں مار رہے ہوں، ہنسی مذاق ہو رہا ہو فقرے چست کئے جا رہے ہوں۔ طائف کی گلیوں میں محمد رسول اللہ ﷺ پر پتھر برسائے جا رہے ہیں، خاص طور پر ٹخنوں کی ہڈیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے جس کے تصور ہی سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے، جسم مبارک لہو لہان ہو گیا ہے، خون بہہ رہا ہے اور نعلین میں آ کر جم گیا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ نقاہت کی وجہ سے آپ بیٹھ جاتے ہیں تو غنڈے آگے بڑھتے ہیں، ایک داہنی بغل میں ہاتھ ڈالتا ہے دوسرا بائیں میں اٹھا کر کھڑا کر دیتے ہیں کہ چلو!! طائف کی گلیوں میں کیا کچھ نہیں ہوا حضور ﷺ کے ساتھ!.... گویا۔

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری

تنہا پس زنداں کبھی رسوا سر بازار

کئی برس بعد مدنی دور میں ایک بار حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ کیا آپ (ﷺ) پر یومِ اُحد سے زیادہ سخت بھی کوئی دن گزرا ہے؟ اس لئے کہ ان کی ہوش میں حیاتِ طیبہ کا سخت ترین دن یومِ اُحد تھا جس میں آپ (ﷺ) کے وندانِ مبارک شہید ہوئے، زیادہ خون بہہ جانے کے باعث ضعف و نقاہت سے آپ (ﷺ) پر بے ہوشی بھی طاری ہوئی، آپ کے انتہائی قریبی عزیز اور جان نثار ساتھیوں کی لاشیں آپ کی نگاہوں کے سامنے آئیں۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ نے اسی حوالے سے آپ سے سوال کیا تھا کہ اس سے بھی زیادہ کوئی سخت دن آپ پر گزرا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، طائف کا دن مجھ پر اس سے کہیں زیادہ بھاری تھا۔ اُحد کے دامن میں تو وہ جان نثار بھی آپ کے ساتھ تھے جنہوں نے آپ کی حفاظت کے لئے جسموں کو ڈھال بنایا ہوا تھا۔ طائف میں سوائے ایک غلام کے اور کوئی آپ کے ساتھ نہیں تھا۔ گویا آپ بالکل یکہ و تنہا تھے اور طائف کی گلیوں میں نقشہ وہ جما جس کے تصور سے لرزہ طاری ہوتا ہے۔ چنانچہ طائف سے واپسی پر ایک جگہ

آپ ﷺ آرام کے خیال سے ذرا بیٹھے تو اس وقت آپ کی زبان پر جو دعا آئی اس نے یقیناً عرش کو ہلا کر رکھ دیا ہوگا۔ ((اللَّهُمَّ إِلَيْكَ أَشْكُو ضَعْفَ قُوَّتِي وَقِلَّةَ جِيلَتِي وَهَوَانِي عَلَى النَّاسِ)) ”اے اللہ! تیری ہی جناب میں شکوہ لے کر آیا ہوں اپنی قوت کی کمی کا، اپنے وسائل و ذرائع کی قلت کا اور اس اہانت و رسوائی کا جو لوگوں کے سامنے ہوئی۔“ ((إِلَى مَنْ تَكَلَّنِي)) ”اے پروردگار! تُو نے مجھے کس کے حوالے کر رکھا ہے۔“ ((إِلَى بَعِيدٍ يَجْهَمُنِي أَوْ إِلَى عَذِوٍ مَلَكَتْ أَمْرِي)) ”کیا میرا معاملہ دشمن کے حوالے کر دیا ہے کہ جو چاہے میرے ساتھ کرگز رے؟“ ((إِنْ لَمْ يَكُنْ عَلَيَّ غَضَبُكَ فَلَا أُبَالِي)) ”اگر تُو ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں۔“ اگر تجھے یہی منظور ہے، یہی پسند ہے تو سر تسلیم خم ہے۔ ((أَعُوذُ بِنُورِ وَجْهِكَ الَّذِي أَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ)) ”پروردگار! میں تیرے ہی روئے انور کی ضیا کی پناہ میں آتا ہوں جس سے تمام تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔“

یوم طائف کے حوالے سے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بہت صحیح نکتہ بیان کیا ہے کہ شخصی اور ذاتی اعتبار سے طائف کا یہ دن محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا آنحضور ﷺ کی ذات کی حد تک ابتلاء و آزمائش کا معاملہ اس آخری انتہا کو پہنچ گیا جس کا ذکر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۴ میں آیا ہے: ﴿مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرُ اللَّهَ؟ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ۝﴾ یہ ابتلاء و آزمائش کا وہ نقطہ عروج ہے جس کے بعد اللہ کی مدد آتی ہے۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے اسی وقت ملک الجبال یعنی وہ فرشتہ جو پہاڑوں پر مامور ہے، آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے عرض کیا کہ اللہ نے مجھے بھیجا ہے، اگر آپ حکم دیں تو میں طائف کے چاروں طرف کے پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دوں کہ طائف کے رہنے والے سرمہ بن جائیں۔ آپ نے فرمایا نہیں، کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت سے نواز دے اور انہیں اسلام لانے کی توفیق عطا فرمادے۔ بہر حال یوم طائف نبی اکرم ﷺ کے لئے ذاتی

اعتبار سے سخت ترین دن تھا کہ اس روز صبر و مصابرت کا مرحلہ آپ کے لئے گویا نقطہ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ پھر اسی سال آپ کی رفیقہ حیات اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا بھی انتقال ہو گیا اور دنیا میں سہارا دینے والے چچا ابوطالب بھی انتقال کر گئے۔ چنانچہ سن دس نبوی کو حضور ﷺ نے ”عام الحزن“ سے تعبیر کیا، یعنی رنج و غم اور افسوس کا سال۔

طائف سے واپس جب آپ ﷺ ملے پہنچے تو حالات اتنے مخدوش تھے کہ مکہ میں داخلہ ممکن نہ تھا۔ آپ نے مکہ کے ایک مشرک سردار مطعم بن عدی کو پیغام بھیجا کہ اگر تم مجھے اپنی پناہ میں لے لو تو میں مکہ میں داخل ہو سکتا ہوں۔ اس نے کہا ٹھیک ہے میں آپ کو حمایت کا یقین دلاتا ہوں۔ حضور ﷺ نے دوبارہ پیغام بھجوایا کہ اس طرح نہیں، تم خود آؤ اور مجھے لے کر جاؤ۔ حالات اس درجے ناموافق اور نامساعد ہو چکے ہیں کہ مطعم بن عدی اپنے چھ بیٹوں کو لے کر ہتھیار لگا کر آتا ہے اور نبی اکرم ﷺ کو لے کر مکہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد البتہ حالات کا رخ بدلتا ہے اور بظاہر مایوسی و ناامیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں امید کے دیئے روشن ہونے لگتے ہیں!

### نصرتِ الہی کا ظہور

طائف سے واپسی کے بعد سے لے کر ہجرتِ مدینہ تک اڑھائی تین سال کا عرصہ ہماری اس وقت کی گفتگو کے لحاظ سے دو اعتبارات سے قابلِ توجہ ہے۔ ایک یہ کہ نصرتِ خداوندی کا ظہور اس شان کے ساتھ ہوتا ہے کہ سن گیارہ نبوی میں مدینہ کے چھ افراد نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آتے ہیں۔ اس کا ذکر اس سلسلہ درس میں پہلے بھی کسی موقع پر ہو چکا ہے۔ چشمِ تصور سے دیکھئے! حج کا موسم ہے، مختلف جگہوں سے آئے ہوئے قافلے مختلف وادیوں میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں، اللہ کا رسول ﷺ اللہ کے پیغام کو عام کرنے اور مخلوقِ خدا کو راہِ راست پر لانے کی شدید آرزو دل میں لئے ایک وادی میں سے گزر رہا ہے۔ ایک جگہ چھ افراد ملتے ہیں، ان کے سامنے آپ اپنی دعوت پیش کرتے ہیں، وہ چھ افراد بیثرب کی بستی سے آئے ہیں، آپ کی بات سن کر وہ

منکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ بات ہوتی ہے کہ یہودی جو دعویٰ کرتے تھے کہ ایک نبی کے ظہور کا وقت قریب ہے شاید یہ وہی نبی ہیں۔ آؤ کہ ہم ان پر ایمان میں سبقت کر لیں، مبادا یہودی ہم سے آگے بڑھیں اور وہ پہلے ان کی تصدیق کر دیں۔ گویا اوس اور خزرج کو یہود کے ذریعے سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ ان کے ایمان کا ذریعہ بن گئیں۔ (واضح رہے کہ یثرب میں دو قبائل اوس اور خزرج آباد تھے جنہیں ہم وہاں کے قدیم باشندے قرار دے سکتے ہیں جبکہ یہودیوں کے بھی تین قبائل مدینے کے قرب و جوار میں آ کر آباد ہو گئے تھے) اگلے سال سن بارہ نبوی میں بارہ افراد ایمان لے آئے اور انہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت عقبہ اولیٰ ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے آنحضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اپنا کوئی نمائندہ ہمیں دیجئے جو ہمیں قرآن کی تعلیم دے۔ سورۃ الجمعہ کا درس ذہن میں لائیے قرآن حکیم ہی حضور ﷺ کی دعوت کے مرکز و محور کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ”قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند“ کے مصداق اس عظیم کام کے لئے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہوتا ہے۔

یہاں ان کا شخصی تعارف کرادینا بہت مناسب ہوگا۔ یہ ایمان اس وقت لائے جب ابھی بالکل نو عمر تھے۔ بڑے ہی ناز و نعم میں پرورش ہوئی۔ ان کے لئے دو دو سو درہم کا جوڑا شام سے تیار ہو کر آتا تھا۔ نہایت قیمتی اور معطر لباس میں ملبوس جہاں سے گزرتے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے، لوگ اشارہ کرتے کہ وہ مصعب جا رہا ہے۔ ایمان لے آئے تو گھر والوں نے سب کچھ چھین کر بالکل برہنہ حالت میں نکال باہر کیا کہ اگر تم نے آباء و اجداد کے دین کو چھوڑا ہے تو اپنے آباء و اجداد کی دولت اور ان کی وراثت سے بھی تمہیں کوئی حصہ نہیں مل سکتا۔ اب وہ نو جوان ہر شے سے کٹ کر محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہی مصعب ہیں کہ جن کے نام قرعہ فال نکلتا ہے اور وہ معلم قرآن بنا کر یثرب بھیج دیئے جاتے ہیں۔ وہاں ان کا نام ”المُقَرَّی“ (پڑھانے والا) مشہور ہو گیا۔ ان کی محنت کا حاصل یہ تھا کہ اگلے سال سن ۱۳ نبوی کے

حج کے موقع پر ۵۷ افراد جن میں ۲۷ مرد اور ۳ عورتیں شامل تھیں، محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کے لئے حاضر ہوئے۔ بیعت عقبہ ثانیہ ہو رہی ہے۔ یہی بیعت ہجرت مدینہ کی بنیاد بن گئی، اس لئے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے یہ معاہدہ کیا کہ آپ ہمارے ہاں تشریف لائیے، ہم آپ کی اسی طرح حفاظت کریں گے کہ جیسے اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں۔ یہ معاہدہ ہوا اور ہجرت مدینہ کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔ بہر حال نصرتِ خداوندی کا ظہور اس طور سے ہوا کہ کہاں طائف میں یہ حالت تھی کہ آپ خود وہاں تشریف لے گئے اور ہر جانب سے انتہائی مایوس کن جواب ملا اور کہاں یہ کیفیت کہ مدینہ منورہ میں آنحضور ﷺ کے قدم ابھی پہنچے بھی نہیں، آپ کا ایک ادنیٰ جان نثار وہاں جا کر دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اور وہاں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایک انقلاب آ گیا، اوس اور خزرج کے سربراہ آوردہ لوگ ایمان لے آئے۔ اللہ نے مدینہ کو حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے لئے سورۃ الانفال کی آیت نمبر ۲۶ کے مطابق ایک پناہ گاہ اور دعوتِ اسلامی کا مرکز بنادیا۔ بہر حال ایک طرف تو نصرتِ خداوندی کا یہ ظہور ہے، اسے نگاہ میں رکھئے اور دوسری طرف مکہ اور اہل مکہ کے ساتھ جو ہو رہا ہے، اسے بھی ذہن میں لائیے!

### مصالحات کی کوشش۔ دام ہمرنگِ زمین

اس دور میں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ مصالحت کی ایک بھرپور کوشش ہوئی جس میں ولید بن مغیرہ نے مرکزی کردار ادا کیا۔ بالکل ابتدائی سورتوں میں سورۃ مدثر اور سورۃ نون (جسے سورۃ القلم بھی کہتے ہیں) مشرکین میں سے جس نمائندہ کردار کا مذمت کے انداز میں ذکر ہے وہ جامہ ولید بن مغیرہ پر ہی راست آتا ہے۔ یہ شخص بالکل آغاز ہی میں دل سے قائل ہو چکا تھا کہ محمد (ﷺ) حق پر ہیں۔ حقیقت اس پر منکشف ہو چکی تھی۔ ایک وقت وہ بھی آیا تھا کہ اس کے ساتھیوں کو یہ خطرہ ہو گیا تھا کہ اس پر محمد کا جادو چل گیا ہے، لیکن مصلحتوں، مفادات اور چودھراہٹ کی بیڑیاں اس کے پاؤں میں پڑی رہ گئیں اور وہ محروم رہا۔ لیکن بعد میں محسوس یہ ہوتا ہے کہ مسلسل اس کی یہ کوشش رہی کہ

کوئی مصالحت ہو جائے۔ چنانچہ یہ وہ وقت ہے کہ جس کے دوران وہ مصالحانہ کوششیں پوری شدت کو پہنچ گئیں۔ اس ضمن میں چند واقعات ملتے ہیں اور آج کے درس کے لئے جن آیات کو عنوان بنایا گیا تھا ان کا مضمون بھی اسی سے متعلق ہے۔ کسی داعی حق کے لئے یہ مصالحت کا دام ہم رنگ زمین انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ یہ معاملہ وہ ہے کہ اس میں اگرچہ براہ راست مقابلے یا مخالفت کی فضا نہیں ہوتی اور بظاہر انداز میٹھا ہوتا ہے لیکن اگر کہیں اس دام ہم رنگ زمین میں کوئی داعی حق گرفتار ہو جائے تو لامحالہ اس کی منزل کھوٹی ہو جائے گی اور معاملہ ختم ہو جائے گا۔ مکے میں جو حالات تھے ان کے پیش نظر بر بنائے طبع بشری آپ کا ان سے متاثر ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ آپ جانتے تھے کہ اگر ان سرداروں میں سے کوئی ایمان لے آئے تو اس سے ایمان اور اسلام کے لئے راستے کھل جائیں گے اور یہ چیز اہل ایمان کے لئے بہت تقویت کا باعث ہوگی جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام سے اہل ایمان کو دنیوی اعتبار سے سہارا ملا۔ یہی وہ بات تھی کہ جس کے تحت جب یہ سردارانِ قریش آپ کے پاس مصالحانہ گفتگو کے لئے آتے تھے تو حضور ﷺ پذیرائی فرماتے اور ان کی جانب ملتفت ہوتے۔ اسی سلسلے میں وہ واقعہ پیش آیا کہ جس کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ گرفت بھی ہوئی۔ ایک نابینا صحابی عبد اللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ ایک بار ایسے وقت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے جب آپ سردارانِ قریش سے گفتگو فرما رہے تھے حضرت عبد اللہ بار بار حضور ﷺ کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتے، جس پر حضور ﷺ کے چہرے پر کسی قدر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے۔ سورۃ عبس کے آغاز میں اسی واقعے کا حوالہ ہے:

﴿عَبَسَ وَتَوَلَّى ۖ اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی ۚ وَمَا يُدْرِیْكَ لَعَلَّہٗ یُزْشٰی ۚ اَوْ یَذْکُرُ فَتَنْفَعُہُ الذِّکْرٰی ۚ اَمَّا مَنْ اَسْتَفْغٰی ۚ فَانْتَ لَہٗ تَصَدٰی ۚ وَمَا عَلَیْكَ اِلَّا یُزْشٰی ۚ وَاَمَّا مَنْ جَاءَكَ یَسْعٰی ۚ وَهُوَ یَخْشٰی ۚ فَانْتَ عَنْہٗ تَلْہٰی ۚ کَلَّا اِنَّہَا تَذٰکِرَۃٌ ۚ فَمَنْ شَاءَ ذَکُرْہٗ ۝﴾

”تیوری چڑھائی اور رخ پھیر لیا کہ ان کی خدمت میں ایک نابینا حاضر ہوا۔ اور



تمہیں کیا معلوم شاید کہ وہ پاکیزگی حاصل کرتا یا نصیحت اخذ کرتا تو وہ نصیحت اس کے لئے فائدہ بخش ہوتی۔ اور وہ کہ جو بے پروائی اختیار کرتا ہے تو تم اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہو (یعنی سردارانِ قریش کی جانب آپؐ خصوصی التفات فرماتے اور آپؐ کی کوشش ہوتی کہ وہ ایمان لے آئیں) اور جو چل کر آتا ہے اور جس کے دل میں خشیت ہے (تزکیہ حاصل کرنے کی طلب ہے) تو تم اس سے اعراض کرتے ہو۔ ہرگز نہیں یہ تو بس ایک یاد دہانی ہے تو جو چاہے اس نصیحت کو اخذ کرے (اس سے فائدہ اٹھالے)۔“

### آنحضور ﷺ کے لئے خصوصی ہدایات

آنحضور ﷺ کو یہاں توجہ دلائی گئی کہ اگرچہ آپؐ کی یہ خواہش اپنی جگہ بجا ہے کہ سردارانِ قریش ایمان قبول کر لیں تاکہ مسلمانوں کے لئے آسانی ہو جائے، لیکن ان کی جانب آپؐ کا یہ غیر معمولی التفات بھی مناسب نہیں ہے۔ آپؐ انہیں ایمان کی دعوت ضرور دیجئے لیکن یہ انداز اختیار نہ کیجئے! یہی بات سورہ کہف کی ان آیات میں آئی ہے:

﴿وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ كِتَابِ رَبِّكَ ۖ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَلَنْ

تَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ۝﴾

کہ اے نبی! جو کتاب آپؐ پر نازل فرمائی گئی ہے اس کی تلاوت کیجئے، اسے پڑھتے رہئے۔ آپؐ کے صبر و ثبات کی اصل اساس یہ ہے..... یہ مضمون اس سے پہلے ہمارے سابق درس سورہ العنکبوت میں بھی آچکا ہے جہاں اکیسویں پارے کی پہلی آیت بعینہ انہی الفاظ سے شروع ہوتی ہے: ﴿وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ ۖ...﴾ اور جان لیجئے کہ اللہ کے فیصلوں کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ آپؐ کی جدوجہد کا نتیجہ کب ظاہر ہوگا، راستہ کہاں سے نکلے گا یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ آپؐ اپنا فرض منصبی ادا کیجئے، آپؐ کے ذمے تو بس صاف صاف پہنچا دینا ہے کسی کے پیچھے پڑ کر اپنے لئے یا اس دین کی دعوت کے لئے کسی درجے میں بھی کسی ہلکے پن کا کوئی امکان پیدا نہ ہونے دیجئے۔ ﴿وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ۝﴾ اور سمجھ لیجئے کہ آپؐ کو پناہ تو بس اللہ ہی کے ہاں

ملے گی، وہی پناہ مہیا فرمائے گا، نصرت و تائید وہیں سے ملے گی۔ ان اسباب ظاہری کی جانب آپ ملتفت نہ ہوں، ان کی طرف زیادہ توجہ نہ فرمائیں، آپ کا بلا و ماویٰ بس اللہ ہی کی ذات ہے۔

اگلی آیت میں فرمایا:

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدْوَةِ وَالْعَشيِّ﴾

یہاں لفظ ”صبر“ کو نوٹ کیجئے جو منتخب نصاب کے اس حصے کا اصل موضوع ہے جو ہمارے زیر مطالعہ ہے۔ صبر کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ان فقراء اور ضعفاء کے ساتھ مصاحبت اختیار کیجئے جو اگرچہ کمزور اور بے حیثیت لوگ ہیں لیکن ایمان لائے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حضرت نوح علیہ السلام سے ان کی قوم کے سرداروں نے کہا تھا: ﴿هُمْ أَرَادُوا بَادِيَ الرِّأْيِ﴾ کہ اے نوح! ہم تمہارے پاس کیا آکر بیٹھیں اور تم سے کیا بات کریں؟ تمہارے ارد گرد تو ان لوگوں کا جھگھا ہوتا ہے جو ہمارے معاشرے کے گھٹیا اور کمین لوگ ہیں! ہم تمہاری بات سنیں تو کیسے تمہارے پاس آئیں تو کیسے؟ یہی معاملہ سردارانِ قریش کا بھی تھا، وہ بھی اس بات پر معترض تھے کہ آپ کے آس پاس بیٹھنے والے تو اکثر وہ لوگ ہیں جو ہمارے غلاموں کے طبقے سے ہیں، ان کی موجودگی میں ہم آپ کی محفل میں کیسے آسکتے ہیں؟ لیکن حضور ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ تو بس اپنے آپ کو انہی فقراء کے ساتھ تھام کر رکھئے۔ یہ لوگ اگرچہ دنیاوی اعتبار سے بے حیثیت ہیں، دنیوی مال و اسباب ان کے پاس نہیں ہے، لیکن یہ ایمان اور محبتِ الہی کی دولت سے مالا مال ہیں، یہ صرف اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہ صرف اس کی رضا کے طالب ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿وَلَا تَعْدُ عَيْنُكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ آپ کی نگاہیں ان درویشوں سے ہٹ کر ان سردارانِ قریش کی جانب متوجہ نہ ہونے پائیں کہ کہیں دیکھنے والے کو یہ مغالطہ ہو کہ شاید آپ بھی دنیا کی چمک دمک سے متاثر ہو گئے ہیں اور شاید دنیا کی ظاہری زیب و زینت اور چہل پہل سے آپ نے بھی کوئی

تاثر قبول کر لیا ہے۔

آیت کے اگلے ٹکڑے میں فرمایا: ﴿وَلَا تُطِيعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ﴾ کہ یہ جو مصالحت کے لئے سردار ابن قریش آپ کے پاس آتے ہیں ان کے اصل باطن کو دیکھئے یہ حق کو پہچاننے کے بعد اس سے اعراض کر رہے ہیں ان کے کہنے میں نہ آئے ان کی چکنی چڑی باتوں سے آپ متاثر نہ ہوں۔ یہ لوگ اپنی خواہشات کا اتباع کر رہے ہیں ہماری یاد سے ان کے دل غافل ہیں۔ ہم نے انہیں محروم کر دیا ہے اپنی یاد کی لذت سے۔ ان کی پوری زندگی ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہیں۔ ﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ اور اے نبی! ان سے ڈنکے کی چوٹ کہئے: مجھے تمہاری کوئی خوشامد نہیں کرنی مجھے چا پلوسی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ تمہارے رب کی جانب سے حق ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔ ﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ﴾ تو جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے انکار کر دے۔ داعی حق کے لئے استغنا کا یہ انداز برقرار رکھنا ضروری ہے تاکہ لوگ اس مغالطے میں مبتلا نہ ہوں کہ اس کی کوئی ذاتی غرض اس دعوت کے ساتھ کسی درجے میں ملحق ہو گئی ہے۔

اس کے بعد غیظ و غضب کے انداز میں کفار کے انجام کا ذکر ہے۔ فرمایا: ﴿إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا﴾ ہم نے ان ظالموں کے لئے وہ آگ فراہم کی ہوئی ہے جو ان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لے گی جیسے کہ قاتلین ہوتی ہیں۔ ﴿وَإِنْ يَسْتَفِئُوا يُفَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ﴾ اور اگر یہ چیخیں گے پکاریں گے فریاد کریں گے تو ان کی فریادری اس پانی سے کی جائے گی جو کھولتے اور پگھلے ہوئے تانبے کی مانند ہوگا کہ جس سے ان کے منہ جل کر رہ جائیں وہ پانی ان کے چہروں کو بھون کر رکھ دے گا۔ ﴿بَنَسْ الشَّرَابِ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا﴾ وہ بہت ہی بری شے ہوگی پینے کی اور بہت ہی برا ہوگا وہ انجام جس سے یہ دوچار ہوں گے۔

”کوئی اور قرآن پیش کرو“۔ مشرکین کا ایک مطالبہ

یہاں دیکھئے کہ اس پر فریب مصالحانہ روش کی کس شدت کے ساتھ مذمت کی گئی

ہے اور اس دام ہمرنگ زمین میں کسی داعی حق کے گرفتار ہو جانے کے امکان یا اندیشے کا کس شدہ و مدہ اور کتنے اہتمام کے ساتھ سد باب کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سردارانِ قریش کی جانب سے اس مرحلے پر ایک خاص بات یہ پیش کی گئی کہ اے محمد (ﷺ)! ہمیں تم سے کوئی ذاتی پر خاش نہیں ہے، تم سے ہمارا کوئی جھگڑا یا ذاتی نوعیت کی کوئی لڑائی نہیں ہے، لیکن یہ قرآن جو تم پیش کر رہے ہو ہمارے لئے ناقابل قبول ہے۔ ٹھیک ہے کچھ باتیں اپنی منوالو کچھ ہماری مانو، کچھ لے دے کر معاملہ کر دے یہ قرآن تو بہت rigid (بے لچک) ہے، لہذا یا تو کوئی اور قرآن پیش کر دو جو اس سے مختلف ہو یا اسی میں کوئی تغیر و تبدل کر کے کچھ لچک پیدا کر دو، تبھی ہمارے اور تمہارے مابین کوئی مفاہمت اور مصالحت ہو سکتی ہے۔

اس پوری صورت حال کو ذہن میں رکھتے بظاہر اسلام کے فروغ کا کہیں کوئی امکان نظر نہیں آ رہا، ہر چہار طرف سے راستے بند نظر آتے ہیں، یہ درست ہے کہ نبوت کے گیارہویں سال مدینہ کی جانب سے ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلتی ہے، چھ افراد حضور کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، اگلے سال اس کھڑکی کا حجم کچھ بڑھ جاتا ہے، ایمان لانے والوں کی تعداد چھ سے بڑھ کر بارہ ہو جاتی ہے لیکن باقی تو ہر چہار طرف گھپ اندھیرا ہے، کہیں کسی جانب سے روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی، کچھ پتہ نہیں چلتا کہ راستہ کدھر سے نکلے گا۔ ان حالات میں امکانی طور پر بر بنائے طبع بشری یہ خیال دل میں آ سکتا ہے کہ چلو حکمتِ عملی کا تقاضا سمجھ کر ہی کچھ لے دے کر معاملہ کر لیا جائے تاکہ بات کچھ تو آگے بڑھے، اگر ہمارا موقف اسی طریقے سے بالکل دو ٹوک اور بے لچک (rigid) رہا پھر تو معاملہ بالکل ٹھپ ہو کر رہ جائے گا، راستہ کھلنے کے تمام امکانات مسدود ہو کر رہ جائیں گے۔ اس امکان کو سامنے رکھتے اور دیکھتے قرآن مجید اس سلسلے میں کیا ہدایات دیتا ہے۔ سورہ یونس سے سورہ مؤمنون تک مکی سورتوں کا جو طویل سلسلہ ہے ان میں سے اکثر و بیشتر سورتیں اسی دور میں نازل ہوئی ہیں۔ سورہ یونس میں فرمایا گیا:

﴿وَإِذَا تُلِيٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٌ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا إِنَّتُمْ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلُوهُ﴾

کہ جب ان مشرکین کو ہماری روشن آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ کہ جو ہم سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے، جنہیں یہ گمان ہی نہیں ہے کہ ہمارے حضور میں حاضری ہو گی، کہتے ہیں کہ اے محمد (ﷺ)! اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن پیش کرو یا اس میں کچھ تبدیلی کرلو۔

### قرآن کا دو ٹوک جواب

جواباً نبی اکرم ﷺ سے کہلوا یا گیا: ﴿قُلْ مَا يَكُونُ لِيْٓ أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِيْ﴾ اے نبی! کہہ دیجئے، میرے لئے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میں اسے اپنے جی سے بدل دوں، اپنی مرضی سے اس میں کوئی ترمیم کر دوں۔ ﴿إِنْ أَتَّبِعْ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ﴾ میں تو خود پابند ہوں اس کا کہ جو مجھ پر وحی کیا جا رہا ہے۔ ﴿إِنِّيْ أَخَافُ أَنْ عُصِيتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے تو خود اندیشہ ہے اپنے پروردگار کی طرف سے ایک بہت بڑے دن کی سزا کا۔

یہ مضمون قرآن حکیم میں ایک سے زائد مرتبہ آیا ہے، لیکن جیسا کہ قرآن مجید میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر مضمون کے لئے کوئی ایک مقام ایسا ہوتا ہے کہ جہاں وہ مضمون اپنے نقطہ کمال کو پہنچ جاتا ہے، اسی طرح اس مضمون کا ذرۃ السام یا نقطہ کمال (Climax) سورہ بنی اسرائیل کے وسط میں ملتا ہے۔ آیت نمبر ۷۳ سے بات شروع ہوتی ہے: ﴿وَإِنْ كَذَّبُوا لَيُفْتِنَنَّوْكَ عَنِ الدِّئِيِّ أَوْ خِينَا إِلَيْكَ لِنَفْتَرِيْ عَلَيْنَا غِيْرَهُ﴾ اور اے نبی! یہ لوگ تو اس پر ادھا رکھائے بیٹھے ہیں کہ کسی طرح آپؐ کو بچلا دیں اس چیز کی طرف سے جو ہم نے آپؐ کی جانب وحی کی ہے (یعنی قرآن حکیم) تاکہ آپؐ اس کے سوا کوئی چیز اپنے پاس سے گھڑ کر ہماری طرف منتوب کر دیں۔ وہ تو آپؐ پر پورا دباؤ ڈال رہے ہیں اور اپنی پوری قوتیں اس پر صرف کر رہے ہیں کہ کسی طرح آپؐ کو اس موقف سے ہٹا کر مصالحت پر آمادہ کر دیں کہ کچھ لے دے کہ بات

بن جائے اور کوئی ایسی بات اللہ کی طرف منسوب کر دی جائے کہ جس سے ان کے شرکانہ موقف کی بھی تائید ہوتی ہو۔ فرمایا: ﴿وَإِذَا لَا تَخْلُوكَ خَلِيلًا﴾ اور اگر آپ ایسا کر لیں تو پھر تو وہ آپ کو اپنا دوست بنالیں گے، جھگڑے اور اختلاف کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اگلی آیت اس مضمون کے اعتبار سے بہت اہم ہے: ﴿وَلَوْلَا أَنْ تَبْتَئِكَ لَقَدْ كَذَّبْتَ تَوَكَّنْ إِلَيْهِمْ شَيْنًا قَلِيلًا﴾ اور اے نبی! اگر ہم ہی نے آپ کو ثبات عطا نہ کیا ہوتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ آپ ان کی جانب کچھ تھوڑا سا جھک ہی جاتے۔ یہ ہے طبع بشری کا وہ تقاضا اور حالات سے متاثر ہونے کا امکان جس کا واضح ذکر یہاں موجود ہے۔ جب چاروں طرف سے راستہ بند نظر آتا ہو تو امکانی طور پر یہ بات ذہن میں آ سکتی ہے کہ وقتی طور پر اگر کچھ تھوڑی بہت مصالحت کر کے کام نکال لیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے، پھر جب حالات ہمارے کنٹرول میں آجائیں گے تو ہم پھر اپنے اصل موقف کی طرف رجوع کر جائیں گے۔ اسی امکان کا دروازہ بند کرنے کے لئے قرآن حکیم میں حضور ﷺ کو مختلف اسالیب میں صبر کرنے اور ثابت قدم رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ سورۃ النحل کے آخر میں فرمایا: ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ﴾ کہ اے نبی! صبر کیجئے اور آپ کا صبر اللہ ہی کے سہارے ہے۔ آپ کے صبر کے لئے اصل سہارا اللہ ہی کی ذات ہے۔ اللہ پر بھروسہ اُس پر توکل اور ”تفویض الامور الی اللہ“ ہی درحقیقت بندہ مؤمن اور بالخصوص داعی حق کے صبر کی اساس اور جڑ بنیاد ہے۔

اگلی آیت میں الفاظ کی ظاہری سختی پر ذرا نظر کیجئے، اسی سختی اور درشتی کا رخ اصل میں کفار کی طرف ہے، کان ان کے کھولے جارہے ہیں، انہیں سنایا جا رہا ہے کہ ہمارے نبی سے اس بات کی توقع نہ رکھو کہ وہ تمہاری باتوں میں آ کر اللہ کے کلام میں تغیر و تبدل کی جسارت کریں گے، لیکن ظاہراً خطاب یہاں حضور ﷺ کی طرف ہے: ﴿وَإِذَا لَا ذُقْنِكَ ضَعْفَ الْحَيَاةِ وَضَعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا﴾ اے نبی! اگر بالفرض ایسا ہو جاتا تو ہم آپ کو دو گنا مزہ چکھاتے دنیا کی زندگی کے

عذاب کا اور دو گنا ہی موت کے عذاب کا اور آپؐ ہمارے مقابلے میں کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے۔

اس کے ساتھ ہی اگلی آیت میں اشارہ ہو رہا ہے ہجرت مدینہ کی طرف۔ ہمارے پچھلے سبق میں جو سورۃ العنکبوت کی بعض آیات پر مشتمل تھا، ہجرت حبشہ کی طرف اشارہ ان الفاظ میں تھا: ﴿يُعْبَادِي الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةً فَإِيَّايَ فَاعْبُدُونِ﴾ اے میرے وہ بندو جو مجھ پر ایمان لائے ہو! میری زمین کشادہ ہے، پس بندگی صرف میری کرو۔

پائے مرا لنگ نیست  
ملک خدا تنگ نیست!

تمہیں ہر حال میں اللہ کی بندگی کرنی ہے اور اس کی خاطر اپنے وطن اور اپنی سرزمین کو چھوڑنا پڑے تو بے دریغ ہجرت کر جاؤ۔ یہاں سورۃ بنی اسرائیل میں بھی ہجرت کا اشارہ دے دیا: ﴿وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّوكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا﴾ اور یہ لوگ تو اب تلے ہوئے ہیں اس پر کہ آپؐ کے قدم اکھاڑ دیں اس سرزمین سے۔ ان مشرکین کی پوری کوشش ہے کہ سرزمینِ مکہ سے آپؐ کو نکال باہر کریں۔ ان کے اس مذموم ارادے پر اللہ تعالیٰ نے نفیاً یہ نہیں فرمایا کہ ایسا نہیں ہو سکے گا، بلکہ صرف یہ فرمایا: ﴿وَإِذَا لَا يَلْبَثُونَ خَلْقَكَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ کہ پھر اس صورت میں یہ لوگ بھی یہاں زیادہ دیر نہ سکیں گے، انہیں بھی یہاں پر اب زیادہ دیر تک تمکن حاصل نہ رہے گا۔ گویا کہ اشارہ ہو گیا کہ ہجرت کا وقت آ رہا ہے۔ لیکن آپؐ کے یہاں سے تشریف لے جانے کے بعد یہ ابو جہل، یہ ابولہب، یہ ولید بن مغیرہ، یہ عقبہ بن ابی معیط، یہ عتبہ بن ربیعہ، یہ سب لوگ زیادہ دیر اس مکے کی سرزمین میں آباد نہ رہیں گے، یہ بہت جلد کفر کردار کو پہنچیں گے۔ فرمایا: ﴿سَنَّةٌ مِّنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسْتِنَا نَحْوِنَا﴾ یہ ہمارا مستقل ضابطہ اور قاعدہ ہے ان تمام رسولوں کے بارے میں کہ جنہیں ہم نے تم سے پہلے بھیجا اور ہمارے اس ضابطے میں تم کبھی کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

پھر جس طرح سورۃ العنکبوت کے درس میں یہ بات ہمارے سامنے آئی تھی کہ اس طرح کی کٹھن اور مشکل صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مسلمان کا اصل سہارا نماز اور ذکر الہی ہے، اسی طرح یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اگلی آیت میں نماز کی تاکید ہے: ﴿اقِمِ الصَّلَاةَ لِلذُّلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ﴾ نماز قائم رکھو سورج کے ذرا ڈھلنے کے بعد رات کے تاریک ہو جانے تک! ظہر سے عشاء تک چونکہ اوپر تلے نماز میں آتی ہیں لہذا ان نمازوں کا ذکر اس انداز میں کیا گیا۔ ذہن میں رکھئے کہ اس سورۃ یعنی سورۃ بنی اسرائیل میں معراج کا ذکر ہے اور معراج ہی میں پانچ نمازوں کی فرضیت کا معاملہ ہوا۔ سورج کے ذرا ڈھلنے کے بعد سے لے کر ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں پے بہ پے آتی ہیں، گویا کہ نماز قائم رہتی ہے۔ جو انسان نماز باجماعت کا پابند ہو وہ وقفے وقفے سے مسجد جاتا اور آتا ہے۔ چار نمازوں کا ذکر یوں ہوا اور پانچویں نماز یعنی نماز فجر کا تذکرہ ایک منفرد شان سے ہوا: ﴿وَقُرْآنَ الْفَجْرِ﴾ اور قرآن پڑھنا فجر کا۔ کیونکہ اس میں طویل قراءت کا خاص اہتمام ہوتا ہے دیگر نمازوں کے مقابلے میں قرآن مجید کا زیادہ حصہ پڑھا جاتا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا: ﴿إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا﴾ واقعہ یہ ہے کہ فجر کے وقت قرآن کی جو تلاوت ہوتی ہے اس پر موجودگی ہوتی ہے، یعنی قلب بھی حاضر ہوتا ہے اور جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے فرشتے بھی حاضر ہوتے ہیں رات اور دن دونوں اوقات کے فرشتوں کا اس وقت اجتماع ہوتا ہے۔

فرض نمازوں کے ذکر کے بعد فرمایا: ﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ﴾ اور اے نبی (ﷺ)! ایک چیز آپ کے لئے اضافی طور پر لازم ہے۔ رات میں بھی آپ کھڑے رہا کریں اس قرآن کے ساتھ۔ قرآن کے ساتھ رات کو جاگنے اور قیام کرنے کا حکم بالکل ابتداء میں بھی آچکا تھا: ﴿قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (سورۃ المزمل) یہاں گویا کہ دوبارہ اس کی تاکید ہو رہی ہے کہ آپ کے لئے بالخصوص یہ رات کی نماز بہت ضروری ہے۔ ساتھ ہی ایک بشارت بھی دے دی: ﴿عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ



مَقَامًا مَّحْمُودًا ﴿﴾ کہ ہو سکتا ہے کہ آپؐ کا رب آپ کو مقام محمود عطا فرمائے۔

ابھی تک سورہ بنی اسرائیل کی جو آیات ہم نے پڑھی ہیں ان میں صرف ایک رواں ترجمہ پر ہی اکتفا کیا گیا ہے تا کہ مضمون یہاں تک پہنچ جائے کہ جہاں ہجرت کا حکم وارد ہوا ہے۔ اگلی آیت میں یہ حکم بشکل دعا وارد ہوا ہے:

﴿وَقُلْ رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مَدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مَخْرَجَ صِدْقٍ وَّاَجْعَلْ

لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿﴾

”اور اے نبی! اپنے رب سے یہ دعا کیجئے کہ اے میرے رب! مجھے داخل کر سچائی کا داخل کرنا اور مجھے نکال سچائی کا نکالنا اور میرے لئے خاص اپنے خزانہ فضل سے وہ غلبہ و قوت عطا فرما جو میری پشت پناہ بنے۔“

یہ اللہ کی طرف سے اس انداز میں دعا کی تلقین دراصل اس کی پیشگی قبولیت کے اعلان کے طور پر ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت ایک بشارت ہے محمد رسول اللہ ﷺ کو کہ اب آپؐ کی دعوت ایک دوسرے مرحلے میں داخل ہونے والی ہے۔ اب وہ دور آیا چاہتا ہے کہ جس میں وہ سرزمین کہ جو آپؐ کی دارالہجرت بننے والی ہے وہاں آپؐ کو تمکین اور غلبہ و اقتدار حاصل ہوگا اور اس طرح غلبہ دین حق کی راہ ہموار ہوگی۔ اور کچھ عرصے بعد بالآخر وہ صورت ہو جائے گی کہ حق کا بول بالا ہوگا اور باطل نیست و نابود ہو جائے گا۔ اس کی بشارت اگلی آیت میں موجود ہے: ﴿وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ ﴿﴾ ”اعلان کر دیجئے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا“ اور باطل تو ہے ہی مٹنے والا۔“ یہ تھوڑا سا وقتی غلبہ جو بظاہر باطل کو حاصل ہے اس سے انسان وقتی طور پر متاثر بھی ہو جاتا ہے اور یہ بھی درحقیقت اہل حق کی آزمائش کے لئے ہوتا ہے ورنہ باطل کے لئے ثبات کہاں؟

یہ ہیں وہ مراحل کہ جن سے نبی اکرم ﷺ گزر رہے تھے۔ مکی دور کا ایک اجمالی سا نقشہ رکھ دیا گیا کہ کس کس پہلو سے اور کس کس گوشے سے حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ پر آزمائش آئی اور کس کس اعتبار سے صبر اور مصابرت کی ضرورت پیش آئی۔ بہر حال اس مکی دور کا جو نقطہ اختتام ہے اسے یوں سمجھئے کہ ان ساری مصاحبتی کوششوں کو ان کے

پیش کرنے والوں کے منہ پر مار کر ان سے دو ٹوک الفاظ میں اعلان براءت کیا گیا۔ اس راہ میں اگر تشدد ہوا تو اس کو پامردی سے سہا، فقر و فاقہ آیا تو اسے جھیل، قید و بند آئی تو اسے برداشت کیا، پتھراؤ ہوا تو اس کو انگیز کیا، لالچ دیا گیا تو اس کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑے رہے، مصالحت کی پیشکش ہوئی تو اس کو ٹھکرایا اور آخری اعلان براءت ان الفاظ میں ہوا۔

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ﴿١﴾ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ﴿٢﴾ وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ ﴿٣﴾ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ ﴿٤﴾ وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ ﴿٥﴾ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ﴿٦﴾﴾

یہ اعلان براءت سورہ زمر میں بہت ہی شدت کو پہنچ گیا ہے۔ یوں کہئے کہ اس کا نقطہ عروج یہی مقام ہے: ﴿قُلْ أَغْيَرَ اللَّهُ تَأْمُرُونَنِي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ﴾ ﴿١﴾ اے نادانوں! اے کم علمو! اور نا سمجھ لوگو! اے جاہلو! کیا تم مجھے یہ حکم دے رہے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کو پوجنے لگوں؟ مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو تو درحقیقت تمہاری یہ کوشش اور تمہاری یہ توقع سراسر باطل ہے۔ یہ جماؤ، یہ صبر، یہ تحمل اور یہ مصابرت ہی دراصل اس راہ میں درکار ہے۔

## مدنی دور کے آغاز میں اہل ایمان کو پیشگی تنبیہ سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۵۳ تا ۱۵۷ کی روشنی میں

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ..... اما بعد:

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ . بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ  
﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۱۵۳﴾  
وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا  
تَشْعُرُونَ ﴿۱۵۴﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ  
الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۚ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ  
مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿۱۵۶﴾ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنَ  
رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْتَخِرُونَ ﴿۱۵۷﴾ ..... صدق الله العظيم

مطالعہ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے پانچویں حصے کا تیسرا درس سورۃ  
البقرۃ کی پانچ آیات (۱۵۳ تا ۱۵۷) پر مشتمل ہے۔ ان آیات مبارکہ کا ترجمہ یوں ہے:

”اے ایمان والو! مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے  
ساتھ ہے۔ اور مت کہو ان کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں، مردہ! بلکہ وہ زندہ  
ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں۔ اور ہم لازماً آزمائیں گے تمہیں کچھ خوف سے،  
بھوک سے اور مال و جان کے نقصان سے اور نتائج و ثمرات کے ضیاع سے۔  
اور اے نبی! خوشخبری سنا دیجئے ان صبر کرنے والوں کو کہ جن پر اگر کوئی مصیبت  
ٹوٹی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں لوٹ جانا  
ہے۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ جن پر ان کے رب کی جانب سے عنایتیں ہیں اور یہی  
ہیں وہ لوگ کہ جو راہ یاب ہونے والے ہیں۔ (منزل مراد تک پہنچنے والے ہیں۔)

ان آیات سے درحقیقت سورۃ البقرۃ کے نصف ثانی کا آغاز ہو رہا ہے تاہم اس بات کو سمجھنے کے لئے سورۃ البقرۃ کے زمانہ نزول کو ذہن میں رکھنا اور اس کے مضامین کے درمیان جو ایک نہایت گہری حکیمانہ ترتیب ہے اس پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ زمانہ نزول کے اعتبار سے سورۃ البقرۃ پہلی مدنی سورت ہے۔ تقریباً ڈھائی پاروں پر پھیلی ہوئی اور ۲۸۶ آیات پر مشتمل قرآن حکیم کی یہ طویل ترین سورۃ اکثر و بیشتر ان آیات پر مشتمل ہے جو ہجرت کے فوراً بعد سے لے کر غزوہ بدر سے متصلاً قبل تک وقتاً فوقتاً نازل ہوئیں۔ صرف چند آیات مستثنیٰ ہیں مثلاً سود کی حرمت سے متعلق آیات اور قرض کے لین دین سے متعلق احکام پر مشتمل طویل آیت جو کہ مدنی دور کے آخری زمانے سے متعلق ہیں یا پھر سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیتیں جن کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ وہ معراج کی شب نبی اکرم ﷺ کو اُمت کے لئے تحفے کے طور پر عطا ہوئیں۔ باقی تقریباً پوری سورۃ ہجرت کے فوراً بعد سے لے کر غزوہ بدر سے متصلاً قبل کے عرصے کے دوران نازل ہوئی جس کا دورانیہ کم و بیش دو سال بنتا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس سے متصلاً قبل سورۃ الحج ہے اور ان دونوں سورتوں کے مضامین میں بڑی گہری مناسبت ہے گو مصحف میں ان کے مابین لگ بھگ پندرہ پاروں کا فصل ہے سورۃ البقرۃ بالکل آغاز میں ہے اور تیسرے پارے کے قریب نصف تک چلی گئی ہے جبکہ سورۃ الحج سترہویں پارے کے نصف آخر میں ہے تاہم زمانہ نزول کے اعتبار سے یہ دونوں سورتیں متصل ہیں۔

### سورۃ البقرۃ۔ دو اُمتوں کی سورت

سورۃ البقرۃ کے دو بڑے بڑے حصے ہیں۔ پہلے حصے میں رکوعوں کی تعداد دوسرے حصے کے مقابلے میں قدرے کم ہے لیکن آیات کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ حصہ اٹھارہ رکوعوں اور ایک سو باون آیات پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے حصے میں رکوع بائیس ہیں اور آیات ایک سو چونتیس ہیں۔ گویا ایک خوبصورت توازن یہاں موجود ہے۔ تقریباً نصفین پر یہ سورۃ مبارکہ تقسیم کی جاسکتی ہے۔ نصف اول میں خطاب کا رخ

تقریباً کل کا کل بنی اسرائیل کی طرف ہے جبکہ نصف ثانی میں خطاب اُمتِ مسلمہ سے بحیثیت اُمتِ مسلمہ ہے۔ ویسے بنی اسرائیل سے براہِ راست خطاب کا آغاز پانچویں رکوع سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ پندرہویں رکوع تک چلا گیا ہے۔ گویا مسلسل دس رکوع بنی اسرائیل سے براہِ راست گفتگو پر مشتمل ہیں۔ اس سورۃ مبارکہ کے ابتدائی چار رکوع تمہیدی نوعیت کے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو رکوعوں میں تین قسم کے افراد کا ذکر آیا ہے اور پھر قرآن کریم کی بنیادی دعوت کا خلاصہ دو رکوعوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ وہاں بھی اگرچہ بین السطور یہود کا ذکر موجود ہے تاہم ان سے براہِ راست خطاب نہیں ہے۔

پھر پانچویں رکوع سے یہود کے ساتھ براہِ راست خطاب کا آغاز ہوتا ہے اور یہ سلسلہ پندرہویں رکوع تک چلا گیا ہے۔ اس میں یہود یعنی بنی اسرائیل کو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے کی مؤثر دعوت بھی ہے اور ان پر ایک نہایت مفصل قرارِ دِاِ جرم بھی عائد کی گئی ہے اس لئے کہ ان کی حیثیت سابقہ اُمتِ مسلمہ کی تھی۔ یہود اڑھائی ہزار برس تک اس منصب پر فائز رہے نبوت و رسالت کا سلسلہ ان کے یہاں لگاتار جاری رہا آسمانی کتابیں انہیں عطا کی گئیں۔ اس پورے عرصے کے دوران شریعتِ الہی کے وہ حامل رہے۔ یوں کہتے کہ وہ اڑھائی ہزار برس تک اللہ کی زمین پر اللہ کی نمائندہ اُمت تھے۔ انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی جو ناقدری کی شریعتِ الہی کو جس طرح بازیچہ اطفال بنایا اللہ کی کتاب میں جس طرح سے تحریف کی وہ دنیا پرستی میں جس طرح غرق ہوئے اور دین کا جو حلیہ انہوں نے بگاڑا اس سب کا ذکر کر کے گویا یہ اعلان فرما دیا گیا کہ انہیں ان کے منصبِ جلیلہ سے معزول کیا جا رہا ہے اور ان کی جگہ ایک نئی اُمت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کی بنیاد پر برپا کی جا رہی ہے۔ یہ ہے وہ مضمون کہ جس کے لئے سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع میں اگرچہ یہود کے لئے دعوتی انداز بھی ملتا ہے لیکن پھر دسویں رکوع تک ملامت کا رنگ غالب ہے ان کے جرائم کی طویل فہرست کا بیان ہے بلکہ یوں کہتے کہ ایک مفصل قرارِ دِاِ جرم ہے جس کے نتیجے میں وہ اس مقام و مرتبے سے محروم اور اس عظیم منصب سے معزول ہوئے جس پر وہ اڑھائی

ہزار برس تک فائز رہے اور اب اُمتِ مسلمہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اس مقام پر فائز کی گئی ہے۔

چنانچہ پندرہویں رکوع سے لے کر اٹھارہویں رکوع تک ان چار رکوعوں میں اسی اہم تبدیلی کی جانب اشارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان رکوعوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے کہ جو بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں کے جدِ امجد تھے اور اس اعتبار سے دونوں کے نزدیک یکساں طور پر محترم تھے۔ پھر ان رکوعوں میں خانہ کعبہ کی تعمیر کا باہتمام ذکر آیا ہے اور بوقتِ تعمیر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیلؑ کی دعا کا ذکر ہے کہ اے پروردگار! ہماری نسل میں سے ایک اُمت برپا کیجیو اور ان میں اپنا ایک نبی مبعوث فرماؤ! اس دعا کا ذکر پندرہویں رکوع میں ہے۔ اور پھر گویا کہ یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب وہ اُمت برپا ہو گئی ہے اور اُس نبی کی بعثت ہو گئی ہے جس کے لئے حضرت ابراہیم اور ان کے فرزند اسماعیل (علیہما السلام) نے دعائیں مانگی تھیں۔ اب اس نبی کی نبوت و رسالت کی بنیاد پر ایک اُمت وجود میں آ چکی ہے جسے ایک نہایت بلند منصب عطا کیا گیا ہے۔ چنانچہ سترہویں رکوع میں وہ آیہ مبارکہ آئی جس میں نئی اُمت کی تشکیل کا ذکر ہے:

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكَ جَعَلْنَاكَ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ  
الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾

”اور اسی طرح بنایا ہے ہم نے تمہیں ایک درمیانی اُمت (ایک بہترین اُمت) تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ اور رسول تم پر گواہ بن جائیں۔“

نئی اُمت کیوں تشکیل دی گئی؟

سورۃ الحج کے آخری رکوع میں یہی مضمون ایک دوسری ترتیب سے آیا تھا کہ اے مسلمانو! اپنے نصیب پر فخر کرو کہ اس نے تمہیں ایک اہم منصب کے لئے چن لیا ہے پسند کر لیا ہے۔ ﴿هُوَ اجْتَبَاكُمْ﴾ تم نبوت و رسالت کے سلسلے میں ایک مستقل کڑی کی حیثیت سے شامل کر لئے گئے ہو۔ یہ سب کچھ کس لئے ہے؟ ﴿لِيَكُونَ الرَّسُولُ

شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ﴿۱﴾ ”تا کہ رسول تم پر گواہ بن جائیں اور تم پوری نوع انسانی پر دین حق کی گواہی دینے والے بن جاؤ۔“ گویا دونوں مقامات پر ایک ہی مضمون مختلف ترتیب کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ یہ شہادت علی الناس کا مضمون سورۃ الحج کے درس کے ضمن میں وضاحت کے ساتھ آچکا ہے۔ پھر انہی رکوعوں میں دو مرتبہ وہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ کے اساسی طریق کار کا بیان ہے۔ پہلے تو پندرہویں رکوع میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا میں وہ الفاظ وارد ہوئے اور پھر اٹھارہویں رکوع میں جہاں اس دعا کی قبولیت کا اعلان ہے وہاں یہ الفاظ اس شان کے ساتھ آئے:

﴿كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ.....﴾

گویا کہ اُمتِ مسلمہ کے مقصد وجود اور اس کی غرض تائیس کا نمایاں انداز میں ذکر سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑی ہی اہم اور قابل توجہ بات ہے اس لئے کہ چھوٹی سی انجمن بھی اگر بنائی جاتی ہے تو آغاز ہی میں اس کے اغراض و مقاصد معین کئے جاتے ہیں کہ یہ ادارہ کیوں تشکیل دیا جا رہا ہے اور کون سا اہم کام ہے جو اس کے پیش نظر ہے اس انجمن کی غرض تائیس کیا ہے؟ وغیرہ۔ سوچئے کہ اتنی بڑی اُمت اگر تشکیل دی گئی ہے تو لازماً اس کے بھی کچھ اغراض و مقاصد ہوں گے۔ یہی درحقیقت اس آیت کا موضوع ہے۔

آگے بڑھنے سے قبل لفظ ”اُمۃ“ کے مفہوم پر بھی غور کیجئے: اُمّ۔ یَوْمُ کے معنی ہیں قصد کرنا، ارادہ کرنا۔ اُمت سے مراد ہے ہم مقصد لوگوں کا ایک گروہ یا ایک جماعت۔ ایک مشترک نصب العین رکھنے والے اور ایک ہی ہدف اور منزل مقصود رکھنے والے لوگ اُمت قرار پاتے ہیں۔ اس پس منظر میں سمجھئے کہ مسلمانوں کو اُمت اس لئے بنایا گیا ہے کہ وہ فریضۂ نبوت اور کارِ رسالت جو پہلے انبیاء و رسل ادا کیا کرتے تھے اب ختم نبوت کے بعد قیامت تک یہ ذمہ داری اس اُمت کو ادا کرنی ہے۔ لوگوں تک اللہ کے

دین کو پہنچانے کا فریضہ اب اس اُمت کے حوالے کیا گیا ہے۔ اسی فریضے کا عنوان ہے ”شہادت علی الناس“ اور ”اتمامِ حجت“ کہ اپنے قول و فعل سے دین حق کی گواہی دینا اور اللہ کی طرف سے خلقِ خدا پر حجت قائم کر دینا تا کہ محاسبہٴ اخروی کے وقت وہ یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ اے اللہ تیری ہدایت ہم تک پہنچی نہیں، ہمیں معلوم نہ تھا کہ تو کیا چاہتا ہے، ہمیں بتایا ہی نہیں گیا کہ تیری مرضی کس چیز میں ہے! سورۃ النساء میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿لِنَلَّا يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ (آیت ۱۶۵)

”تا کہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے (محاسبہ کے) مقابلے میں کوئی دلیل اور حجت باقی نہ رہے اور اللہ تو ہے ہی سب پر غالب کمالِ حکمت والا۔“

تو سورۃ البقرۃ کے پندرہویں رکوع سے لے کر اٹھارہویں رکوع تک یوں سمجھئے کہ وہی مضامین جن کا مطالعہ ہم سورۃ الحج، سورۃ القف اور سورۃ الحجۃ میں بڑی تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں، یہاں ایک ذرا مختلف ترتیب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ خاص طور پر اُمت کے فرضِ منصبی کے حوالے سے ان سب مضامین کو بیان کرنے کے بعد اب خطاب شروع ہوتا ہے مسلمانوں سے بحیثیتِ اُمتِ مسلمہ کہ اپنے فرائض کی عظمت کو پہچانو، ایک بڑا کٹھن اور نہایت بھاری بوجھ ہے جو تمہارے کاندھے پر آ گیا ہے۔ اس پہلو سے یہ مقام سورۃ المَزْمَل کی ابتدائی آیات کے بہت مماثل ہے کہ جہاں آنحضور ﷺ کو آغازِ وحی کے بالکل ابتدائی دور میں شخصی طور پر خطاب کر کے کچھ خصوصی ہدایات دی گئیں اور پیشگی آگاہ کر دیا گیا: ﴿إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا﴾ (اے نبی!) ہم آپ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔“ کارِ رسالت کی بھاری ذمہ داری آپ کے کاندھوں پر ڈالی جا رہی ہے۔ چنانچہ اسی موقع پر یہ تلقین بھی کی گئی کہ ﴿وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا﴾ کہ ان مخالفین کی



باتوں پر آپ صبر کیجئے اور استقامت کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی پر کمر بستہ رہیے اور ان مخالفین کو خوبصورتی کے ساتھ نظر انداز کر دیجئے!

### اُمّت سے پہلا باضابطہ خطاب

اب کارِ رسالت کا یہ بوجھ چونکہ اُمّت کے کاندھوں پر آ رہا ہے یہ اجتماعی ذمہ داری ہے جو اُمّت کو تفویض کی جا رہی ہے لہذا اُمّت سے خطاب ان الفاظ میں ہوا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۖ

”اے اہل ایمان! مدد حاصل کرو صبر سے اور نماز سے۔“

حکم ہو رہا ہے کہ دعوت و تبلیغ دین کی اہم ذمہ داری اور فریضہ شہادت علی الناس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے قوت پکڑ و صبر و ثبات سے سہارا و تحمل سے اور نماز سے کہ جو اللہ کے ذکر کی ایک اعلیٰ شکل اور اس کے ساتھ ایک مضبوط تعلق قائم رکھنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔

اگرچہ اس سے پہلے ہمارے اس منتخب نصاب میں ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ کے الفاظ متعدد بار آچکے ہیں یہاں تک کہ صرف سورۃ الحجرات میں پانچ مرتبہ یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں لیکن یہاں ان الفاظ کے حوالے سے ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ قرآن حکیم کا یہ وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں سے بحیثیت اُمّت مسلمہ گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے۔ اُمّت کی تشکیل کے اعلان کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمانوں کو باضابطہ خطاب کیا گیا اور اس کے لئے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا کے الفاظ لائے گئے۔ یہ بات بہت سے حضرات کے لئے شاید قابلِ تعجب ہو کہ پورے مکی قرآن میں کہیں يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا کے الفاظ نہیں آئے۔ قرآن مجید کا قریباً دو تہائی حصہ مکی سورتوں پر مشتمل ہے اور پورے مکی قرآن میں يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا کے الفاظ سے خطاب نہیں ملتا۔ اس قاعدے میں استثناء صرف ایک ہے اور وہ سورۃ الحج کا وہی مقام ہے جو ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے لیکن یہ بات ذہن میں رکھئے کہ اس سورۃ کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں اختلاف چلا آ رہا ہے۔ بہت سے حضرات اسے مدنی مانتے

ہیں اور اس کی بعض آیات کے بارے میں تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ مدنی دور میں نازل ہوئیں۔ وہ یقیناً یا تو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں یا اثنائے سفر ہجرت میں ان کا نزول ہوا۔ اس پہلو سے یہ استثناء بھی باقی نہیں رہتا اور یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ پورے مکی قرآن میں **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** کے الفاظ نہیں آئے۔

آیت زیر نظر سے قبل سورۃ البقرۃ میں اگرچہ صرف ایک مرتبہ یعنی آیت ۱۰۴ میں **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** کے الفاظ وارد ہوئے ہیں لیکن وہ بھی ایک ضمنی بات کے طور پر اصل میں مسلمانوں سے بحیثیت اُمتِ مسلمہ خطاب شروع ہو رہا ہے سورۃ البقرۃ کی اس آیت ۱۵۳ سے۔ اس کے بعد مدنی سورتوں میں **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** کا انداز خطاب نہایت کثرت سے ملتا ہے۔ مکی قرآن میں خطاب جہاں بھی ہے وہ براہِ راست محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے ہے بصیغہ واحد۔ ہاں تبعاً آپؐ کی وساطت سے مسلمان بھی اس خطاب کے مخاطب ہوتے ہیں لیکن قرآن حکیم میں مسلمانوں کو بحیثیت اُمت خطاب کا آغاز مدینے میں آکر ہوا کہ جہاں مسلمان ایک اُمت کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور تشکیل اُمت کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا تھا۔ یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اگرچہ مکے میں بھی ان کی حیثیت ایک جماعت کی اور ایک Revolutionary party کی تھی لیکن ان کی بحیثیت اُمتِ مسلمہ باقاعدہ تاج پوشی (Coronation) مدینے میں ہوئی اور اس کی علامت کے طور پر تحویلِ قبلہ کا معاملہ ہوا۔ دوسرے پارے کے بالکل آغاز میں یہ حکم وارد ہوا کہ تمہارا قبلہ بدل دیا گیا ہے آئندہ نماز میں بیت المقدس کی طرف رخ نہیں ہوگا بلکہ **فَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** کہ اب پھیر لو اپنے چہروں کو مسجد حرام کی جانب۔ ایک نئے مرکز کے گرد ایک نئی اُمت کی تشکیل کا اعلان کر دیا گیا اور اسی اعتبار سے اب قرآن مجید میں مسلمانوں سے خطاب کے لئے مستقل اصطلاح ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا**۔

ایک نئے دورِ آزمائش کا آغاز

بہر حال اس مرحلے پر یہ آیات ایک پیشگی تنبیہ کا درجہ رکھتی ہیں کہ مسلمانو! یہ نہ

سمجھو کہ ہجرت کے بعد اب تمہاری تکالیف کا دور ختم ہو گیا، مشکلات اور مصائب کا دور اب بیت گیا تم نے ہجرت کی ہے فرار کی راہ اختیار نہیں کی یہ درحقیقت اپنے مشن اور مقصد کی طرف پیش قدمی کے لئے ایک مرکز ہے جو اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے تمہاری جدوجہد اب ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی ہے اب بھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں! ابھی تو بڑی آزمائشیں آئیں گی۔ اصل کشن مراحل تو ابھی آنے ہیں کہ جن سے تمہیں سابقہ ہوگا اس لئے کہ تمہاری یہ دعوت اور تحریک اب ایک ایسے مرحلے میں آگئی ہے کہ جہاں نظریاتی تصادم اور کشش سے آگے بڑھ کر عملی تصادم یعنی جہاد بالسیف اور قتال کا آغاز کرنا ہوگا۔ گویا تم Passive Resistance کے مرحلے سے Active Resistance کے دور میں داخل ہو گئے ہو۔ اب صرف جھیلنے اور برداشت کرنے کے مرحلے سے آگے بڑھ کر باطل پر حملہ آور ہونے اور دشمن پر ضرب لگانے کا وقت آ رہا ہے تو اچھی طرح سمجھ لو کہ آنے والا دور ہرگز کوئی آسائشوں اور آرام کا دور نہیں ہے بلکہ تمہارے لئے نئی نئی آزمائشوں کے دروازے کھل رہے ہیں لہذا ان آزمائشوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے صبر و ثبات اور نماز سے قوت و استقامت حاصل کرو۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾

ابتلاء و آزمائش کے مرحلے کے لئے اصل ہتھیار۔ صبر اور نماز

اس مرحلے پر تمہاری قوت کی اساس اور تمہارے صبر و ثبات کی بنیاد دو چیزوں پر ہے، ایک صبر اور دوسرے نماز۔ یہی دو چیزیں ہیں کہ جن کو تم اپنی مدافعت اور اپنے ثبات کے لئے اپنا سہارا اور بنیاد بناؤ۔ اسْتَعِينُوا کا مفہوم ہے مدد چاہو قوت پکڑو۔ ذہن میں رکھئے کہ اس سے پہلے ہم سورۃ العنکبوت کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ ہم نے اس کے پہلے رکوع کو تفصیل سے پڑھا، پھر ہم نے دیکھا کہ جن حالات سے اُس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دوچار تھے اس میں انہیں جو ہدایات دی گئیں ان کا نقطہ آغاز یہی ہے۔ چنانچہ پانچویں رکوع کے آغاز میں فرمایا گیا:

﴿أَتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ ۖ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۖ﴾

”(اے نبی!) تلاوت کرتے رہئے جو وحی کیا گیا آپ کی طرف کتاب میں سے اور نماز قائم کیجئے۔ یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔“

یہی بات ہم سورہ بنی اسرائیل میں دیکھ چکے ہیں۔ وہاں پر بھی فرمایا گیا کہ اے نبی! اگرچہ جو مصالحانہ پھندے آپ کے لئے لگائے گئے آپ اللہ کے فضل و کرم سے ان سے بچ نکلے، لیکن صبر و ثبات کے لئے بنیاد وہی اقامتِ صلوٰۃ ہے:

﴿اقِمِ الصَّلَاةَ لِللُّوْكَ الشَّمْسِ إِلَىٰ غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ ۖ﴾ (آیت ۷۸)

”قائم رکھئے نماز کو سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور قرآن پڑھنا فجر کا۔“

اور سورۃ العنکبوت میں تلاوتِ قرآن حکیم اور اقامتِ صلوٰۃ کے حکم کے ساتھ ہی فرمایا:

﴿وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾ ”اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی شے ہے۔“ اور تلاوتِ قرآن حکیم اور اقامتِ صلوٰۃ اللہ کے ذکر اور تعلق مع اللہ کی بہترین صورتیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ کسی بھی انقلابی کارکن کے لئے اپنی انقلابی جدوجہد میں ثابت قدم رہنے کا دار و مدار اپنے مقصد اور نصب العین کے ساتھ پوری یکسوئی کے ساتھ وابستگی اور لگاؤ پر ہے۔ اپنے نصب العین سے اس کی وابستگی جس قدر گہری ہوگی، ذہن اور قلب کے اندر اس کی جڑیں جتنی گہری اتری ہوئی ہوں گی، اسی قدر وہ اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو برداشت کرے گا، مصائب کو جھیلے گا، امتحانات میں کامیابی سے درآتا ہوا گزر جائے گا اور آزمائشوں کی بھٹیوں میں سے سرخرو ہو کر نکلے گا۔ یہ جدوجہد چونکہ اللہ کے لئے اور اللہ کے دین کے لئے ہے اور اس میں اصل مقصود و مطلوب اللہ کی رضا جوئی ہے لہذا یہاں تمہارے صبر و ثبات کی بنیاد تعلق مع اللہ ہے۔ اللہ کی یاد تمہارے دل میں جس قدر ہوگی اور اللہ تمہارے ذہن سے جتنا قریب تر رہے گا اتنا ہی تم اس راہ میں ثابت قدم رہ سکو گے۔ اور ذکر اللہ کے لئے جو سب سے جامع پروگرام تمہیں دیا گیا وہ ہے نماز۔ چنانچہ یہاں فرمایا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾  
 ”اے اہل ایمان! مدد چاہو صبر سے اور نماز سے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

### اللہ کی معیت اور نصرت کے اصل حق دار کون؟

یہ معیت تائید و نصرت کے معنی میں ہے۔ اس لئے کہ اللہ کی ایک معیت تو وہ ہے جو ہر شے کو حاصل ہے، کیونکہ اللہ ہر جگہ ہر آن موجود ہے۔ ﴿هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾ ”جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو اللہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔“ ان الفاظ میں اللہ کی معیت عمومی کا ذکر ہے، لیکن اہل ایمان کو اللہ کی جو معیت حاصل ہوتی ہے وہ ہے اللہ کی تائید و نصرت، اس کی طرف سے توفیق و تیسیر، اس کی طرف سے ہمت کا بندھے رہنا اور بشارتوں کا ملتے رہنا۔ یہاں اسی معنی میں فرمایا گیا:

﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾

کہ یاد رکھو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے! اس کی یہ معیت ان لوگوں کو حاصل نہیں ہے جن میں مصائب جھیلنے اور مشکلات برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں، جو تھڑ دلے، بزدل اور کم ہمت لوگ ہیں، جن کا نقشہ سورۃ النساء میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

﴿مُذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَلِكَ لَا إِلَى هَؤُلَاءِ وَلَا إِلَى هَؤُلَاءِ﴾ (آیت ۱۲۳)

جن کی کیفیت یہ ہے کہ دنیا کو بھی چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا، یہاں کی لذات سے کنارہ کشی بھی کسی درجے میں گوارا نہیں ہے، مال و اولاد و تعیشات کی محبتیں بھی دل کے اندر گہری موجود ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ دین کی طرف بھی رغبت ہے۔ ایسے لوگ کسی طرح کا کوئی کام نہیں کر سکتے۔ تائید ربانی اور توفیق الہی تو انہی لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے جو یکسو ہو کر آئیں، جن کے بارے میں پہلے عرض کیا گیا کہ جو ”ہر چہ باد اباد“ ماکشتی در آب انداختیم“ کے سے جذبے کے ساتھ آئیں۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ کی معیت اور توفیق و تائید حاصل ہوتی ہے۔ سورۃ العنکبوت کی آخری آیت بھی ہم پڑھ آئے ہیں:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾  
 ”اور جن لوگوں نے ہماری خاطر جدوجہد کی ہم لازماً انہیں اپنی راہیں بجا دیں گے اور یقیناً اللہ تو احسان کی روش اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اللہ کی تائید اور توفیق ہر دم اُن کے شامل حال رہتی ہے۔

اسی معیتِ خداوندی کا ایک ظہور ہمارے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں آتا ہے۔ حضرت موسیٰ جب بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے اور پیچھے سے فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب شروع کیا تو ایک مرحلہ وہ آیا کہ بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا، سامنے سمندر تھا اور پیچھے نظر آ رہا تھا کہ فرعون اور اس کا لشکر چلا آ رہا ہے، گرداڑا ہوا قریب سے قریب تر پہنچ رہا ہے۔ اُس وقت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے عالم بے چارگی میں کہا: ﴿إِنَّا لَمُدْرِكُونَ﴾ ”(اے موسیٰ!) ہم تو پکڑے گئے (اب تو بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے)۔“ اُس وقت حضرت موسیٰ نے کمالِ دلجمعی کے ساتھ جواب دیا: ﴿كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ﴾ ”نہیں نہیں! میرے ساتھ میرا رب ہے وہ یقیناً مجھے راستہ دے گا۔“ چاہے بظاہر احوال کوئی راستہ نہیں مادی اسباب و وسائل راستہ رو کے کھڑے ہیں لیکن میرا تو کل وانحصار اور میرا تکیہ اور دار و مدار اُس ذات پر ہے جو مسبب الاسباب ہے جو اسباب سے ماوراء ہے وہ یقیناً راستہ نکال دے گا۔ یہی بات غارِ ثور میں حضور ﷺ نے فرمائی تھی۔ جب بر بنائے طبع بشری حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی کچھ گھبرا گئے تھے کہ حضور! یہ لوگ غار کے دہانے تک پہنچ گئے ہیں اور اگر ان میں سے کسی نے غیر ارادی طور پر بھی اپنے قدموں کی طرف نگاہ ڈال لی تو ہم پکڑے جائیں گے۔ اس وقت حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ ”نہیں نہیں، گھبراؤ نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“ تو یہ ہے مفہوم ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ کا۔ یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ معیتِ الہی کا مقام ہے یہ درحقیقت بندہ مؤمن کا آخری سہارا ہے ان حالات میں بھی کہ جہاں کوئی حالت اُمید افزا نظر نہ آ رہی ہو جہاں کہیں کوئی راستہ نکلتا

ہوا دکھائی نہ دے رہا ہو اور امید کی کوئی کرن کسی جانب سے نظر نہ آتی ہو۔ معیتِ خداوندی کا یہ یقین اور اللہ کی تائید و نصرت پر یہ بھروسہ ایک ایسی شے ہے جو بندہ مؤمن کو اس طرح کے انتہائی مایوس کن حالات میں بھی ثابت قدم رکھتی ہے اور وہ اپنی منزل مقصود کی طرف پیش قدمی جاری رکھتا ہے نتائج کو اللہ پر چھوڑتے ہوئے جو کچھ اس کے بس میں ہوتا ہے وہ کئے چلے جاتا ہے۔ لہذا اس مرحلے پر امت کو اس کے فرض منصبی سے آگاہ کرنے اور وہ کٹھن ذمہ داری جو اس کے کاندھے پر آ رہی ہے اس سے مطلع فرمانے کے بعد جو پہلی ہدایت دی گئی وہ یہی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾

اس کے بعد اب فرمایا جا رہا ہے:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا

تَشْعُرُونَ﴾

”اور مت کہو ان کو جو قتل ہو جائیں اللہ کی راہ میں کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ تو زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور حاصل نہیں ہے۔“

یہ مضمون سورہ آل عمران میں بڑے مؤکد انداز میں پھر دہرایا گیا ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ

يُرْزَقُونَ ۚ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ

يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۚ

يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةِ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ

الْمُؤْمِنِينَ﴾ (آیات ۱۶۹-۱۷۱)

”اور ہرگز گمان نہ کرنا ان کے بارے میں جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں کہ وہ مردہ ہیں، نہیں وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں، فرحان و شاداں ہیں اس (انعام و اکرام) سے کہ جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں عطا فرمایا اور خوش خبریاں حاصل کر رہے ہیں ان لوگوں کے بارے میں کہ جو ابھی ان کے ساتھ شامل نہیں ہوئے ان کے پیچھے سے کہ نہ ان پر کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ خوشخبری حاصل کر رہے ہوں گے اللہ کے انعام اور اس کے

فضل پر اور اللہ تعالیٰ مومنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“

### قرآن میں لفظ ”شہید“ کا استعمال

یہاں ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف توجہ دلا دینا یقیناً مفید ہوگا کہ قرآن حکیم میں اگرچہ لفظ شہید کا استعمال متعدد مقامات پر ہوا ہے اور ”شہادت“ قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح ہے لیکن مقتول فی سبیل اللہ کے لئے قرآن لفظ ”شہید“ استعمال نہیں کرتا۔ اس میں استثناء صرف ایک ہے اور وہ ہے سورہ آل عمران کی آیت ۱۴۰۔ وہاں ﴿وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ﴾ میں لفظ ”شُہَدَاءُ“ کو اگر مقتولین فی سبیل اللہ کے معنی میں لیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ دیگر تمام مقامات پر مقتول فی سبیل اللہ کے لئے اس لفظ کا استعمال ہمیں قرآن میں نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ خود نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بھی سورہ آل عمران میں جہاں یہ مضمون آیا ہے وہاں بھی شہید ہو جانے یا شہادت پا جانے کے لئے ”قُتِلَ“ کا لفظ ہی صیغہ مجہول میں آیا ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۖ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۖ أَفَأَنْتُمْ مَاتُمْ أَوْ قُتِلْتُمْ  
انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۖ﴾ (آیت ۱۴۴)

”محمد (ﷺ) اللہ کے ایک رسول ہیں ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں تو اگر ان کا انتقال ہو جائے یا وہ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جاؤ گے؟“

ایک حدیث میں جس میں آنحضور ﷺ نے اپنے لئے شہادت کی تمنا کا اظہار فرمایا ہے وہاں بھی اس ضمن میں ”قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ“ کے الفاظ ہی وارد ہوئے ہیں:

((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوِدِدْتُ أَنِّي أَقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، فَأُقْتَلَ، ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلَ، ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلَ)) (رواہ البخاری عن ابی ہریرہؓ)

”اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میری دلی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جنگ کروں اور قتل ہو جاؤں پھر مجھے زندہ کیا جائے پھر مقتول ہو جاؤں (اللہ کی راہ میں) اور پھر مجھے زندہ کیا جائے اور پھر قتل کر دیا جاؤں۔“

ذہن میں رکھئے کہ قرآن مجید میں لفظ شہادت کا استعمال اصلاً دین حق کی گواہی



دینے کے لئے ہے۔ اللہ کے خالق و مالک ہونے کی گواہی، اللہ کی توحید کی گواہی، محمد ﷺ کی صداقت اور رسالت کی گواہی۔ (یع دے تو بھی محمد کی صداقت کی گواہی) آخرت کے حق ہونے کی گواہی، خیر کی گواہی، قرآن کی حقانیت کی گواہی۔ اور یہ گواہی صرف اپنے قول سے ہی نہیں عمل سے بھی دینی ہے۔ یہ ہے ہر مسلمان کا فرض اور اس کے لئے قرآن کی اصطلاح ہے ”شہادت علی الناس“ جو تمام مسلمانوں کا فرض منصبی ہے بحیثیت اُمتِ مسلمہ۔ اس لفظ شہادت کو قرآن مجید نے اس معنی کے لئے خاص کیا ہے۔ تاہم احادیث میں مقتول فی سبیل اللہ کے لئے لفظ شہید کا استعمال بھی مل جاتا ہے۔ اس لئے ان دونوں الفاظ میں اس اعتبار سے ایک گہرا معنوی ربط موجود ہے کہ جس شخص نے حق کے غلبے کی اس جدوجہد میں اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کر دی اس نے گویا کہ آخری درجے میں شہادت دے دی، دین کی خاطر اپنی زندگی دے کر گویا اپنی جان سے دین حق کی گواہی دے دی۔ اب وہ شہید (گواہ) کہلانے کا تمام و کمال مستحق ہو گیا۔

### شہداء کی برزخی حیات!

آیت کے آخری ٹکڑے میں شہداء کی زندگی کے بارے میں ﴿وَلَكِنْ لَا تَسْأَلُونَ﴾ کے الفاظ میں ہمارے لئے بڑی اہم رہنمائی مضمر ہے۔ شہداء کو اللہ جس نوع کی حیات عطا فرماتا ہے اور برزخی زندگی میں بھی جس طور سے انہیں رزق مہیا فرماتا ہے اس تک ہمارے فہم و ادراک کی رسائی نہیں ہے اس دنیا میں رہتے ہوئے ہم اس کی کیفیت کو نہیں جان سکتے۔ بد قسمتی سے برزخی زندگی کے حوالے سے مسلمانوں میں ایک مذہبی بحث (Controversy) نے بڑے ہی شدت اختیار کی ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں ایک بڑی بنیادی رہنمائی ہمیں اس آیت سے ملتی ہے۔ وہ بحث یہ ہے کہ عالم برزخ میں نبی اکرم ﷺ کی حیات کی نوعیت کیا ہے اپنی قبر شریف میں آنحضور ﷺ کس حال میں ہیں!! یہ مسئلہ ہمارے مذہبی حلقوں میں نامعلوم کیونکر بحث و تمحیص، قیل و قال اور رد و قدح کا موضوع بن گیا! حالانکہ ہمیں یہ بات اچھی طرح

معلوم ہے اور یہ قرآن حکیم کی بنیادی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت ہے کہ موت خاتمہ کا نام نہیں ہے نہ کسی مؤمن کے لئے نہ کافر کے لئے۔ ادھر آنکھ بند ہوتی ہے تو دوسرے عالم میں کھل جاتی ہے۔ یہ عالم برزخ ہے جس کا تسلسل قیامت تک رہے گا۔

اس برزخی دور میں ایک نوع کی حیات تمام انسانوں کے لئے ہے۔ اس برزخی حیات کا مرحلہ کافروں کے لئے بھی ہے اور مؤمنین کے لئے بھی، تاہم زندگی کی کیفیات مختلف ہیں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر قبر یا تو جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ یہاں قبر سے مراد مٹی کا وہ ڈھیر نہیں جس کے نیچے انسان مدفون ہوتا ہے بلکہ یہاں یہ اپنے وسیع تر مفہوم میں ہے اور اس سے مراد عالم برزخ ہے۔ چنانچہ خواہ کوئی شخص سمندر میں غرق ہو کر مرا ہو عالم برزخ میں وہ ایک خاص کیفیت سے گزرتا ہے اس کے آخری انجام کا ایک عکس پڑتا رہتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ابو جہل یا ابولہب کے ساتھ عالم برزخ میں جو معاملہ ہو رہا ہے وہ کچھ اور ہے اور کوئی مسلمان عالم برزخ میں جس کیفیت سے گزر رہا ہے وہ کچھ اور ہے، کوئی مؤمن صالح وہاں کسی اور کیفیت میں ہوگا، شہداء کا کچھ اور عالم ہوگا اور صدیقین کی شان کچھ اور ہوگی، انبیاء و رسل کا مرتبہ و مقام کچھ اور ہوگا اور سید المرسلین، سید الاولین والآخرین ﷺ اس عالم برزخ میں جس شان میں ہوں گے وہ ہمارے فہم اور تصور سے ماوراء ہے بلکہ وراء الراء ثم وراء الراء ہے۔ جب ہم شہداء کی برزخی زندگی کا کوئی تصور قائم نہیں کر سکتے اور اس کی نوعیت کا تعین نہیں کر سکتے جیسا کہ قرآن نے صاف طور پر کہہ دیا ہے: ﴿وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ کہ تمہیں اس کا شعور حاصل نہیں ہے تو نبی اکرم ﷺ کی برزخی حیات کے بارے میں کوئی تصور کرنا ہمارے لئے قطعاً ناممکن ہے۔ یہ چیز ہمارے فہم و شعور اور تخیل و ادراک کی گرفت میں آنے والی ہے ہی نہیں۔ اس معاملے میں بحث کرنا ہی دراصل اپنی حدود سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ کہنا کہ حضور ﷺ بالکل اسی طرح زندہ ہیں جیسے کہ اس دنیا میں زندہ تھے ایک اعتبار سے شاید آپ کی توہین قرار پائے اس لئے کہ یہ دنیا کی زندگی تو بہت سی احتیاجات کے ساتھ

ہے اس میں طرح طرح کی تحدیدیں ہیں، عالم برزخ میں نبی اکرم ﷺ کو جو حیات حاصل ہے وہ یقیناً اس سے کہیں اعلیٰ کہیں ارفع ہے جو ہمارے فہم اور ہماری سوچ سے بہت بلند اور بالا ہے۔ بہر حال اس معاملے میں خواہ مخواہ کسی چیز کو معین کر کے اس پر جھگڑنا اور اس کی بنیاد پر ”مَن دِیگرم تُو دِیگری“ کے انداز میں تفریق پیدا کر لینا درحقیقت بڑی ہی نادانی کی بات ہے۔

### ابتلاء و آزمائش - اس راہ کی شرط لازم

اب آئیے اصل سلسلہ کلام کی طرف۔ اگلی آیت میں وہ پیشگی تنبیہ آرہی ہے جس کا حوالہ گفتگو کے آغاز میں دیا گیا تھا:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ  
وَالْأَنْفُسِ وَالْفُتُورِ ط﴾

”اور (اے مسلمانو!) ہم لازماً آزمائیں گے تمہیں کسی قدر خوف سے اور بھوک سے اور مال و جان اور ثمرات کے نقصان سے۔“

اس سے قبل سورۃ العنکبوت کے درس کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ عربی زبان میں یہ تاکید کا انتہائی اسلوب ہے کہ فعل مضارع سے قبل لام مفتوح اور آخر میں نون مشدّد کا اضافہ کر دیا جائے۔ یہی انداز ہمیں اس آیت میں ملتا ہے۔ چنانچہ ”وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ“ کا ترجمہ ہوگا: ”ہم لازماً آزمائیں گے تمہیں“۔ ہم آزمائشوں کی کٹھالیوں میں تمہیں ڈالیں گے، تمہارے صبر و مصابرت کا بھرپور امتحان ہوگا، نہایت کٹھن حالات سے تمہیں گزرنا ہوگا جن کے ذریعے جانچ لیا جائے گا کہ تم کتنے پانی میں ہو، یہ بات خوب کھڑکھڑائی جائے گی کہ ذاتِ باری تعالیٰ پر فی الواقع تمہیں کتنا یقین حاصل ہے، حیات بعد الممات پر کتنا کچھ ایمان ہے، محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر تم کیا کچھ قربان کر سکتے ہو۔ اللہ کی راہ میں اگر تم آئے ہو تو تحفظات (Reservations) کے ساتھ تو نہیں آئے! آزمائشوں اور امتحانات سے جب تمہیں سابقہ پیش آئے گا تو ان میں سے ایک ایک چیز واضح ہو جائے گی۔

”بَلَا يَبْلُو“ کے معنی ہیں جانچنا اور پرکھنا۔ یہ لفظ لغت میں بنیادی طور پر گوشت کو آگ پر سینکنے کے مفہوم میں آتا ہے۔ اس سینکائی کے عمل میں گوشت کو انگاروں پر الٹا پلٹا جاتا ہے ابھی اس رخ پر ڈالا ہے پھر ذرا پلٹ کر دوسرے رخ پر ڈال دیا۔ یہ ہے اس لفظ کی اصل۔ تمہیں بھی مختلف حالات سے دوچار کر کے سینکا جائے گا، تمہیں آزمایا جائے گا، جانچا اور پرکھا جائے گا۔ البتہ اس آیت مبارکہ میں ”بَشْنِي“ کا ایک لفظ ایسا آیا ہے جس میں تسلی کا پہلو موجود ہے کہ بظاہر تو امتحانات بڑے کٹھن ہوتے ہیں، ایک بار تو انسان دہل کر رہ جاتا ہے، لیکن اگر وہ ثابت قدم رہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بھی نہیں تھا۔ بظاہر ایک خوفناک صورت حال سامنے آتی ہے لیکن اگر انسان ڈٹا رہے تو پتہ چلتا ہے کہ بس ایک ریلا تھا حالات کا، آیا اور گزر گیا۔ دیکھنے والے اس آزمائش کی ظاہری شدت سے متاثر اور مرعوب ہوں گے لیکن صبر و ثبات کے ساتھ اس آزمائش سے گزرنے والوں کو یوں محسوس ہوگا کہ جیسے بڑی ہی ہلکی سی کوئی بات تھی کہ جو ہوگئی۔ ﴿بَشْنِي مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ﴾

ذہن میں رکھئے کہ یہ آیات مدنی دور کے بالکل آغاز میں نازل ہو رہی ہیں۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ان آخری دس سالوں پر جو آپ نے مدینہ میں گزارے اگر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو اس آیت کی عظمت کا مزید انکشاف ہوتا ہے کہ اس پورے مدنی دور میں کس طرح وہ حالات وقفے وقفے سے پیدا ہوتے رہے جن کا پورا نقشہ ایک پیشگی تنبیہ کے طور پر ان آیات میں کھینچ دیا گیا ہے۔ خوف و خدشات ہوں گے، جان و مال کے اندیشے ہوں گے، بھوک اور پیاس سے سابقہ پیش آئے گا، فاقہ کشی کے باعث جان نکلتی ہوئی محسوس ہوگی، جان و مال اور ثمرات کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس راہ میں یہ سارے مراحل آئیں گے۔

### لفظ ”ثمرات“ کا وسیع تر مفہوم

”ثمرات“ کا لفظ یہاں بہت ہی قابل توجہ ہے۔ ثمرات کا عام مفہوم لیا گیا ہے پھل۔ اس اعتبار سے ترجمہ یہ بنتا ہے کہ پھل ضائع ہو جائیں گے۔ مدینہ منورہ کے

مخصوص معاشرتی پس منظر میں یہ مفہوم بجا طور پر سمجھ میں آتا ہے۔ اہل مدینہ بنیادی طور پر کاشتکار تھے، زراعت ان کا پیشہ تھا۔ زراعت کے میدان میں جو محنت بھی کی جاتی ہے، ہل چلایا جاتا ہے، کھیت کی آبیاری کی جاتی ہے، اس ساری محنت کا حاصل چونکہ وہ فصل ہے جو آخر میں کاٹی یا اتاری جاتی ہے اور تمام امیدیں چونکہ اس فصل کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں لہذا اگر فصل اجڑ جائے تو نقصان بہت شدید ہوتا ہے اور یہ آزمائش کی بڑی کٹھن صورتوں میں سے ایک ہے۔ غزوہ اجزاب اور غزوہ تبوک کے مواقع پر اس نوع کے امتحان سے مسلمانوں کو سابقہ پیش آیا تھا۔ فصلیں تیار ہیں، لوگ اس امید میں ہیں کہ فصلیں اتاریں گے، اپنی محنتوں کی کمائی کو گھروں میں لائیں گے، عین اُس وقت حملہ ہوتا ہے، باغات اجڑ دیئے جاتے ہیں یا حکم ہوتا ہے کہ تیار فصلوں کو چھوڑ کر جہاد کے لئے نکلؤ، اور وقت پر فصلیں برداشت نہ کر سکنے کے باعث فصل ضائع ہو جاتی ہے۔ یہ تمام آزمائش کی صورتیں ہیں جن سے مسلمان مدینہ میں گزرتے رہے ہیں۔ البتہ ”ثمرات“ کا لفظ اس سے زیادہ وسیع ہے۔ انسانی محنت خواہ کسی بھی میدان میں ہو، اس کا حاصل دراصل اس کا ثمرہ ہے۔ کسی نے بڑی محنت کر کے کاروبار جمایا ہے، اب دین کی طرف سے پکار آتی ہے کہ آؤ! اور صاف نظر آ رہا ہے کہ دین کی طرف آنے میں کاروبار کا نقصان ہے، تو یہ آزمائش بڑی کڑی ہے۔

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں  
دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

وہ محنت سے جمایا ہوا کاروبار پاؤں میں بیڑی بن کر پڑ جاتا ہے۔ کسی نوجوان نے بڑا وقت لگا کر اور بڑی محنت سے کسی کیریئر میں اپنا کوئی مقام حاصل کیا ہے اور اب دین کے تقاضے سامنے آتے ہیں، دین کا تقاضا اس پر واضح ہوتا ہے کہ آؤ اور کھپاؤ اپنے آپ کو غلبہ و اقامت دین کی راہ میں! وہ کیریئر اور وہ Profession اب انسان کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اسے صاف نظر آ رہا ہے کہ اس طرح اس کی اب تک کی ساری محنت ضائع ہوتی ہے۔

سورۃ الکہف کے ایک مقام سے اگر روشنی حاصل کی جائے تو اولاد بھی انسان کا شمرہ ہے یہ بھی درحقیقت ایک اعتبار سے اس کی کمائی ہے۔ انسان کو اگر ایک درخت سے تعبیر کیا جائے تو اس کا پھل اس کی اولاد ہے۔ نگاہوں کے سامنے اگر اس کی اولاد اللہ کی راہ میں قربان ہو رہی ہو تو گویا یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے اس کا ثمر اس کی نگاہوں کے سامنے اجڑ رہا ہے اور یہ آزمائش کی نہایت کٹھن صورت ہے۔ یہاں متنبہ کر دیا گیا ہے کہ اے مسلمانو! یہ سارے امتحان اب آئیں گے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ  
وَالشَّمْرِ ۖ ط﴾

”اور ہم لازماً آزمائیں گے تمہیں کسی قدر خوف سے، بھوک سے، مال و جان کے نقصان سے، اور ثمرات کے ضیاع سے۔“  
آیت کے آخری ٹکڑے پر اپنی توجہ مرکوز کیجئے! فرمایا:

﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ﴾

”اور (اے نبی!) بشارت دیجئے صبر کرنے والوں کو۔“ (ان کو کہ جو ان تمام آزمائشوں اور مصائب و تکالیف کو پامردی کے ساتھ جھیل جائیں، برداشت کر جائیں)۔

### صبر کا قرآنی تصور

قرآن حکیم کے مطالعے سے صبر کا جو تصور سامنے آتا ہے اس کی رو سے صبر ہرگز کوئی منفی شے نہیں ہے بلکہ یہ ایک مثبت جذبہ ہے۔ کسی مقصد کی تکمیل کی خاطر یا کسی نصب العین اور منزل مقصود تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد میں جو تکالیف آئیں اور اس راہ کی رکاوٹوں سے نبرد آزما ہونے میں جو مصائب آئیں انہیں ثابت قدمی کے ساتھ جھیلنا اور برداشت کرنا صبر ہے جو یقیناً ایک مثبت جذبہ ہے۔ صبر و استقلال کا مظاہرہ کرنے والے باہمت لوگوں کے بارے میں ہی یہ الفاظ یہاں آئے ہیں:

﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ﴾ ”اور (اے نبی!) بشارت دیجئے صبر کرنے والوں کو!“

صبر کے حوالے سے یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ اللہ کی راہ میں قتال کرنے والا کوئی شخص اگر میدان جنگ میں پامردی اور استقامت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے جان بچانے کے لئے وہاں سے راہ فرار اختیار کرے گا تو اس کا یہ عمل دراصل اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس کا سب کچھ کیا دھرا ضائع ہو جائے گا، بلکہ سورۃ الانفال میں تو ایسے شخص کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ تو یہاں پیشگی متنبہ کر دیا گیا کہ اس راہ میں آزمائشیں اور مشکلات تو آئیں گی اور ان میں سرخرو دہی ہو سکیں گے جو صبر و ثبات کا مظاہرہ کریں گے۔ اگلی آیت میں ان صبر کرنے والوں کے ایک نہایت اہم وصف کا ذکر ہے:

﴿الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾

” (وہ صبر کرنے والے کون ہیں؟) وہ لوگ کہ جب بھی کوئی مصیبت اُن پر پڑتی ہے یا کوئی تکلیف انہیں پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہم لوٹنے والے ہیں۔“

اسی سورۃ مبارکہ میں ذرا آگے چل کر وہ آئیہ برہے جو ہمارے اس منتخب نصاب کے حصّہ اول میں شامل ہے۔ وہاں ہم دیکھ چکے ہیں کہ نیکی کی بحث کا نقطہ عروج یہی مضمون ہے: ﴿وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ﴾ ”اور خصوصاً صبر کرنے والے اور جھیلنے والے جسمانی اذیت کو، فقر اور فاقے کو اور وہ کہ جو عین حالت جنگ میں ثابت قدم رہنے والے ہیں۔“ یہاں ان صبر کرنے والوں کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ جب بھی انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے، کوئی پٹان پر پڑتی ہے تو ان کی زبان پر یہ کلمہ جاری ہوتا ہے کہ: ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾

### بندۂ مومن کا نظریہ حیات

ابن آئیہ مبارکہ میں دراصل ایک مسلمان کے نظریہ زندگی اور تصویر حیات کی مکمل عکاسی موجود ہے۔ ہمارا تصویر حیات کیا ہے؟ ہم اللہ کے پاس سے آرہے ہیں اور اللہ ہی کے پاس واپس لوٹ جائیں گے۔ یہ دنیوی زندگی ایک سفر ہے، یہ ہرگز ہماری منزل

نہیں ہے۔ یہ ہمارے سفرِ حیات کا ایک عارضی سا وقفہ ہے۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے ہم پر یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ ہم آئے کدھر سے ہیں اور اپنی اس منزل کا بھی واضح شعور ہمیں ہونا چاہئے جہاں ہمیں جانا ہے۔ اسی حقیقت کا اظہار اس آیتِ مبارکہ میں ہے کہ ہمارا وجود بھی اللہ کا عطا کردہ ہے اور ہمیں حیات بھی اسی نے عطا کی ہے۔ لہذا ع ”سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے!“ اللہ ہمارے بارے میں جو فیصلہ بھی کرے ہمیں قبول ہے۔ اس کی مرضی کے آگے ہمارا سر تسلیم خم ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی عطا ہے۔ ع ”ہرچہ ساقی مار بخت عین الطاف است“ میرے اس پیالے میں میرے ساقی نے جو کچھ ڈال دیا یہ اس کی نگاہِ کرم ہی کے طفیل ہے۔ یہ اس کا عطیہ ہے لہذا دل و جان سے قبول ہے۔ آگے فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ﴾

”یہ ہیں وہ لوگ کہ جن پر اُن کے رب کی طرف سے عنایتیں ہیں اور رحمت ہے۔“

### صلوٰۃ۔ بندے اور رب کے مابین دو طرفہ معاملہ

یہاں لفظ ”صَلَوَات“ بھی خاص طور پر توجہ کے لائق ہے۔ یہ صلوٰۃ کی جمع ہے اور اس سے قبل یہ لفظ ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات کے درس میں آچکا ہے: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ ..... ”صلوٰۃ“ جیسا کہ عرض کیا گیا تھا توجہ کا نام ہے۔ لغت میں اس کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے: ”إِقْدَامٌ إِلَى الشَّيْءِ“ یعنی کسی کی جانب متوجہ ہونا کسی کی طرف رخ کر لینا۔ اسی لئے نماز جس کی اصل روح ہے اللہ کی جانب متوجہ ہو جانا اس کا آغاز ان الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے:

﴿إِنِّي وَجْهْتُ وَجْهِيَ لِلذِّى فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ خَبِيرًا وَمَا أَنَا مِنَ

الْمُشْرِكِينَ﴾

صلوٰۃ درحقیقت ایک دو طرفہ عمل ہے جو اللہ اور بندے کے مابین ہے۔ بندہ جذبہٴ عبودیت کے ساتھ اپنے رب کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور پروردگار شفقت و



عنایت کے ساتھ بندے کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ ذہن میں رکھئے کہ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر عبد و معبود کے ربط و تعلق کو ایک دوہرے اور دو طرفہ تعلق کی شکل میں سامنے لایا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ ہی میں اس مقام سے موصولاً قبل کہ جو ہمارے زیر درس ہے یہ آیت موجود ہے:

﴿فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُون﴾

”پس تم مجھے یاد رکھو میں یاد رکھوں گا اور میرا شکر بجالاؤ اور میری ناشکری نہ کرو!“

اس کی بڑی عمدہ وضاحت ایک حدیث قدسی سے ہوتی ہے جس کی رو سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”اگر میرا بندہ مجھے اپنے جی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور اگر میرا بندہ میرا ذکر کسی محفل میں کرتا ہے تو میں اس سے بہت اعلیٰ محفل میں (یعنی ملائکہ مقررین کی محفل میں) اس کا ذکر کرتا ہوں۔“ اسی طرح کا معاملہ لفظ توبہ کا بھی ہے۔ بندہ اللہ کی جناب میں پشیمانی اور احساسِ ندامت کے ساتھ رجوع کرتا ہے گناہ کے راستے سے واپس پھرتا ہے اور اللہ بھی بندے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اپنی شفقتوں اور عنایتوں کے ساتھ۔ گویا اس کی وہ نگاہِ کرم جو بندے کی جانب سے ہٹ گئی تھی وہ اب پھر اس کی طرف ملتفت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ”نصرت“ کا معاملہ بھی دو طرفہ ہے: ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ ”اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔“ یہ صریحاً ایک دو طرفہ معاملہ ہے۔ اسی طرح شکر کے بھی دو رخ ہیں۔ اللہ بھی شکور ہے اور بندے کے لئے بھی شکور کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بندے کا شکور ہونا اس معنی میں ہے کہ وہ اللہ کا حق مانے اس کا احسان مانے اس کی نعمتوں کا حق ادا کرے اور اس کا شکر بجالائے جبکہ اللہ اس اعتبار سے شکور ہے کہ وہ کوششوں اور قربانیوں کی قدر افزائی فرمانے والا ہے وہ بڑا قدر دان ہے۔ تو ذہن میں رکھئے کہ کچھ اسی طرح کا معاملہ صلوٰۃ کا بھی ہے۔ بندہ اگر اللہ کی طرف متوجہ ہوگا تو اللہ بھی بندے کی طرف کمالِ شفقت کے ساتھ متوجہ ہو جائے گا۔ سورۃ الاحزاب میں نبی اکرم ﷺ کی شان میں جو الفاظ وارد ہوئے وہ چونکہ بالعموم سیرت کی ہر تقریر کا عنوان

جاتے ہیں لہذا اکثر لوگوں کو یاد ہیں:

﴿إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾

یہاں دیکھئے کہ ”صلوٰۃ“ کی نسبت اللہ اور فرشتوں کی طرف ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں ان کی جانب سے آپ پر شفقتوں اور عنایتوں کا مسلسل نزول ہوتا رہتا ہے لیکن نوٹ کیجئے کہ یہ الفاظ صرف نبی اکرم ﷺ کے لئے نہیں آئے بلکہ سورۃ الاحزاب ہی میں بعینہ یہی الفاظ اہل ایمان کے لئے بھی استعمال ہوئے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُہٗ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا﴾

”وہی ہے اللہ جو (اے اہل ایمان!) تم پر عنایتیں بھیجتا رہتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تم پر عنایتیں (درود) بھیجتے ہیں تاکہ وہ تمہیں نکالے اندھیروں میں سے روشنی کی جانب اور وہ اہل ایمان کے حق میں بہت ہی رحیم ہے۔“

یہ ہے لفظ صلوٰۃ کا قرآن حکیم میں استعمال! یہاں فرمایا: ﴿وَأُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ﴾ اللہ کی عنایات اور شفقتوں کا نزول ان لوگوں پر ہوتا ہے جو مشکلات اور آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے والے ہیں جنہوں نے دین کو محض موروثی عقائد اور چند رسومات کا مجموعہ سمجھ کر قبول نہیں کیا بلکہ شعوری طور پر حقائق کو سمجھا، فرائض دینی کا شعور حاصل کیا، دین کی دعوت پر لبیک کہا، جنہوں نے اس حقیقت کو جانا کہ دین کے لئے جان و مال کھپانا اور اس کے غلبہ و اقامت کے لئے قربانیوں کا دینا ہمارے ایمان کا عین تقاضا ہے اور پھر اس راہ کے تمام امتحانوں اور آزمائشوں میں پورے اترے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن پر ان کے رب کی جانب سے عنایتیں ہیں جن کے لئے شاباشیں ہیں جن پر اللہ کی رحمتوں کا مسلسل نزول ہوتا رہے گا۔ اور فرمایا: ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾ ”اور یہی ہیں وہ لوگ جو راہ یاب ہونے والے ہیں“ جو ہدایت یافتہ ہیں۔ نوٹ کیجئے کہ یہاں پھر اسلوبِ حضر ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ

صرف یہی لوگ فی الواقع راہ ہدایت پر گامزن ہیں۔

اس سے قبل سورۃ الفاتحہ کے درس کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ہدایت کے مختلف مدارج ہیں۔ ایک انسان درجہ بدرجہ ہدایت کی منزلیں طے کرتا ہے۔ ایک منزل کے بعد اگلی منزل ہے اور ایک مرحلے کے بعد دوسرا مرحلہ ہے۔ گویا ہدایت ایک مسلسل عمل ہے۔ چنانچہ لفظ ہدایت کا اطلاق اپنے تکمیلی معنوں میں کسی کے منزلِ مراد تک پہنچ جانے کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ اس پہلو سے ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾ کا مفہوم ہوگا: ”یہ ہیں وہ لوگ جو منزلِ مراد تک پہنچ جانے والے ہیں۔“

ان چند آیات میں اہل ایمان کو مدنی دور کے بالکل آغاز میں جن مراحل سے سابقہ پیش آنے والا تھا ان کے بارے میں پیشگی طور پر متنبہ کر دیا گیا اور ساتھ ہی مسلمانوں کو بحیثیت اُمتِ مسلمہ شہادت علی الناس کا جو فرض منصبی سونپا گیا تھا اس کے ضمن میں ہمیشہ ہمیش کے لئے یہ رہنمائی عطا کر دی گئی کہ جو مرتبہ و مقام تمہیں ملا ہے اس کے تقاضے کے طور پر یہ بات جان لو کہ اس راہ میں مصائب و مشکلات آئیں گی آزمائشوں میں سے تمہیں گزرنا ہوگا۔ اس لئے کہ ع جن کے رتبے ہیں سو ان کی سوا مشکل ہے!

### حکمِ قتال اور اس کا ہدف

یہ بات ذہن میں رکھئے کہ سورۃ البقرۃ مدنی سورۃ ہے اور اس کے زمانہ نزول کا اگر تعین کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ ہجرت کے بعد سے لے کر غزوہ بدر سے متصلاً قبل تک کے عرصے میں نازل ہوئی۔ چنانچہ یہ آیات جو ہمارے زیرِ درس ہیں گویا کہ قتال فی سبیل اللہ کے لئے تمہید کا درجہ رکھتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اسی سورۃ مبارکہ میں آگے چل کر چوبیسویں رکوع میں قتال فی سبیل اللہ کے ضمن میں متعین حکم بھی موجود ہے: ﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا﴾ حکم ہو گیا کہ اے اہل ایمان اب اللہ کی راہ میں قتال کرو اور جان لو کہ تمہاری دعوت اب اگلے مرحلے

میں داخل ہو گئی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، سورۃ الحج میں، جو نزولی اعتبار سے سورۃ البقرۃ سے مصلیٰ قبل شمار کی جاتی ہے، اذنِ قتال والی آیت آئی ہے۔ ذہن میں رکھئے کہ قتال کی اجازت اور قتال کا حکم دو مختلف چیزیں ہیں۔ اجازت قتال یہ ہے کہ اب تمہیں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہو گئی:

﴿اِذْنٌ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ بِاَنَّهُمْ ظَلَمُوا ۖ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَبِيرٌ ۝﴾ (آیت ۳۹)

یعنی آج اجازت مرحمت کی جا رہی ہے ان لوگوں کو جن پر جنگ ٹھوسی گئی تھی، جن پر مظالم توڑے گئے تھے، جنہیں ان کے گھربار سے نکالا گیا تھا، جن پر زندگی کا قافیہ تنگ کیا گیا تھا، لیکن جنہیں اب تک اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ تھی، گویا ان کے ہاتھ باندھ دیئے گئے تھے، جیسا کہ سورۃ النساء میں ایک جگہ فرمایا گیا کہ ان سے کہہ دیا گیا تھا: ﴿كُفُّوا اَيْدِيَكُمْ﴾ ”اپنے ہاتھ بندھے رکھو“۔ یعنی جھیلو اور برداشت کرو، جس کے لئے ان دروس میں بار بار Passive Resistance کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ آج ان کے ہاتھ کھول دیئے گئے اور انہیں اجازت دے دی گئی کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت کی نوید بھی دے دی گئی کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے۔

اس کے بعد سورۃ البقرۃ میں حکم قتال وارد ہوا:

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ﴾ (آیت ۱۹۰)

”جو لوگ تم سے جنگ کر رہے ہیں اب تم ان سے جنگ کرو اللہ کی راہ میں۔“

سورۃ البقرۃ کے چوبیسویں رکوع میں جہاں قتال کا یہ حکم آیا ہے وہاں ساتھ ہی

اس کا ہدف بھی معین کر دیا گیا:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنُ فِتْنَةٌ وَيَكُوْنُ الدِّیْنُ لِلّٰهِ ۖ﴾ (آیت ۱۹۳)

”اور ان سے جنگ کرتے رہو (یہ تلواریں جو اب میان سے نکلی ہیں یہ اب میان میں واپس نہیں جائیں گی) جب تک کہ فتنہ بالکل فرو نہ ہو جائے (اللہ کے باغی جب تک ہتھیار نہ ڈال دیں) اور پورا نظام اطاعت اللہ ہی کے لئے

نہ ہو جائے۔“

جب تک اللہ کی زمین پر اسی کا حکم نافذ نہیں ہوتا اور اس کا کلمہ سر بلند نہیں ہوتا اس وقت تک جنگ جاری رہے گی۔ گویا قتال فی سبیل اللہ کا ہدف یہ ہے کہ دین کل کا کل اللہ کے لئے ہو جائے اسی کا جھنڈا سر بلند ہو اسی کی مرضی نافذ ہو اسی کے حکم کی تعمید ہو مختصر یہ کہ اللہ کی زمین پر اللہ ہی کا دین قائم ہو جائے۔ بہر کیف یہ ہے قتال کا باضابطہ حکم جو سورۃ البقرۃ کے چوبیسویں رکوع میں آیا ہے۔

اب ذرا ایک نظر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۴ پر بھی ڈال لیجئے جس کا حوالہ اس سے پہلے سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع کے درس میں دیا جا چکا ہے۔ یہ بات سمجھ لیجئے کہ کسی بھی نظریاتی گروہ یا جماعت میں ہر مزاج اور ہر افتاد طبع کے لوگ ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی جماعت میں جہاں کثیر تعداد میں ایسے باہمت لوگ تھے کہ جنہوں نے حکم قتال کی آیت کے نزول پر خوشیاں منائیں کہ اب ہمارے ہاتھ کھول دیئے گئے اب ہمارے لئے دین کی راہ میں سرفروشی کا وقت آ گیا اور ہمیں اب شہادت کے مواقع نصیب ہوں گے وہاں کچھ وہ بھی ہوں گے کہ جن پر کچھ گھبراہٹ طاری ہوئی ہوگی۔ جن کے لئے یہ نیا مرحلہ جس میں جنگ و قتال سے سابقہ تھا شاید زیادہ ہی کڑی آزمائش بن گیا ہو۔ ایسے لوگوں سے صاف کہہ دیا گیا: ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ ”کیا تم نے یہ گمان کیا تھا کہ تم (سیدھے سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے“ ﴿وَلَمَّا يَبْتَغِمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ ”حالانکہ ابھی تو تم پر وہ حالات آئے ہی نہیں (وہ آزمائشیں وہ کٹھنائیاں اور وہ مشکلات ابھی آئی ہی نہیں) کہ جو تم سے پہلی امتوں کو پیش آئے تھے“ ﴿مَسْتَهْمُ الْبَنَاسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَرُلُؤًا﴾ ”فقروفاقہ اور تکالیف ان پر مسلط ہو گئیں اور وہ ہلا مارے گئے“ ﴿حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرُ اللّٰهُ ۚ اَلَا اِنَّ نَصَرَ اللّٰهُ قَرِيبٌ﴾ ”یہاں تک کہ (وقت کے) رسول اور ان کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی! (تب انہیں خوشخبری سنائی گئی) آگاہ رہو کہ اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔“ اور اس کے ایک ہی آیت کے بعد مسلمانوں سے فرما دیا گیا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ

شُكْرًا لَّكُمْ ﴿۱﴾ ”تم پر یہ قال فرض کر دیا گیا (یہ دعوت آج اپنے اگلے مرحلے میں داخل ہو گئی) اور یہ تمہیں ناپسند ہے۔“ تم پر یہ حکم بڑا بھاری گزر رہا ہے۔ ﴿وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ ”اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو در آنحالیکہ اسی میں تمہارے لئے بہتری ہو۔“ ﴿وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ﴾ ”اور ہو سکتا ہے کہ کسی چیز سے تمہیں محبت ہو (وہ تمہیں پسند ہو) در آنحالیکہ فی الواقع وہ تمہارے لئے شر ہو۔“ ﴿وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ ”اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

ایک آخری بات یہ عرض کرنی ہے کہ یہاں اس سورہ مبارکہ کے مضامین کا چونکہ بحیثیت مجموعی بھی ایک تجزیہ عرض کیا گیا ہے لہذا اسی حوالے سے یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ اسی سورہ مبارکہ میں آگے چل کر تاریخ بنی اسرائیل کی اس اہم جنگ کا تفصیلاً ذکر آیا ہے جسے ان کی تاریخ میں جنگ بدر کے قائم مقام سمجھا جاسکتا ہے جس کے بعد کہ ان کے ذنبوی اقتدار اور جاہ و جلال کے دور کا آغاز ہوا۔ یہ جنگ طالوت اور جالوت کے مابین ہوئی جس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کا وہ عہد حکومت ہے جسے بجا طور پر تاریخ بنی اسرائیل کا زریں دور قرار دیا جاتا ہے۔ اسی سورہ مبارکہ میں اس اہم تاریخی واقعے کا ذکر دراصل مسلمانوں کو متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ اب وہی مرحلہ تمہاری تاریخ میں بھی آیا چاہتا ہے۔ یہ گویا پیشگی خبر تھی غزوہ بدر کی جو نقطہ آغاز ہے ایک طویل سلسلہ قال کا جس کے پہلے مرحلے کا اختتام ہوتا ہے نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں سفر تبوک پر۔ اب ان شاء اللہ آئندہ اس منتخب نصاب کے حصہ پنجم میں صرف ایک تقریر میں کوشش کی جائے گی کہ اس پورے سلسلہ قال پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے۔ و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد  
منبع ایمان — اور — سرچشمہ لفقین

قرآن حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانی — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکر امت کے فیہ عناصر میں تجدید ایمان کی ایک عمومی تحریک پاہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃ ثانیہ — اور — غلبہ دین حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ